ناولٹ

ایک ہاتھ پھیلا تھا

شازیہ چوہدری

ناگہاں پھیل گئی مجھ سے ملاقات کی گرد
ورنہ رسوائی کسی اور سبب ہے اپنی

ہمارے معاشرے میں ہر شخص دوسرے کی زندگی میں مداخلت کرتا ہے۔
اور اس کے قول و فعل کے نتائج دوسرے کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جس کا سربراہ مطلق العنان حکمران بنا ہوا تھا

یہ اے سی عاصم بخاری کا آفس تھا۔ وہ ٹھوڑی پہ ہاتھ ٹکائے کہنیاں میز پر رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھا سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس گھنگریالے بالوں کی ایک شریر لٹ کشادہ پیشانی کو چوم رہی تھی۔ گندمی رنگت، متناسب ناک نقشہ باوقار چہرہ، ذہین سیاہ آنکھیں جن سے شرارت چھلک رہی تھی۔ شاندار کسرتی جسم۔ بلاشبہ وہ دیکھنے میں ایسا جاذب نظر، وجیہہ اور خوش رو تھا کہ کوئی بھی اس پر مرمٹتا مگر وہ خود کسی ماہ رو کے تیرِ نظر کا شکار تھا۔

''اریشہ غزل۔'' اس نے جیسے اس کو سوچتے ہوئے اس کے نام کی کیف پرور اور جان لیوا مہک کو اپنے اندر اتارا۔

''کتنے دن ہوگئے تمہیں دیکھے ہوئے۔'' وہ حساب لگانے لگا۔ ''یوں لگتا ہے صدیاں بیت گئی ہیں۔'' اس نے جذبات سے بوجھل سانسیں فضا میں منتقل کی تھیں۔

محبت انسان کو وہمی بنادیتی ہے۔ ہر وقت کے دھڑکے، ہر وقت کی بے تابی، ہر لمحہ آزمائش ہر گھڑی انکشاف سے لبریز۔ چونکا دینے والے روح گرما دینے والے ماحول اور موسم بدل دینے والے انکشافات پر مشتمل۔

''سر ایس پی صاحب تشریف لا چکے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ محبت کی لطافتوں، گہرائیوں اور شدتوں پر مزید غور و خوض کرتا، سپاہی احمد دین نے سیلوٹ مار کر اطلاع دی۔

''انہیں اندر بھیج دو۔'' اس کا لہجہ بارعب اور سخت ہوگیا۔

''السلام علیکم سر۔'' ایس پی نے حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرکاری پروٹوکول کے مطابق اسے تعظیم دی۔

''بیٹھیے لطیف صاحب......'' عاصم پین کے دونوں سرے دونوں ہاتھوں کے درمیان ٹکا کر بغور ایس پی صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''اوپر سے آرڈر آیا ہے کہ پیشہ ور بھکاریوں کے خلاف مہم چلائی جائے اور شہر کی شاہراہوں، گلی کوچوں اور بازاروں کو ان سے پاک کیا جائے۔ اس سلسلے میں آپ کو بریف کرنے کے لیے طلب کیا گیا ہے۔ آپ تمام تھانوں کے انچارج صاحبان کو مطلع کردیں اور ایک ہفتے کے اندر مجھے رپورٹ دیں۔''

''اوکے سر۔''

''آپ جاسکتے ہیں!'' مزید چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اس نے ایس پی کو روانہ کردیا اور خود میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم ہوگیا۔

☆☆☆

سیاہ چولی، سرخ چھوٹے چھوٹے ڈاٹس والا گھاگرا، کانوں میں سلور کلر کے جھمکے، گلے میں ایمیٹیشن چین، ہاتھوں میں رنگ برنگی پلاسٹک کی چوڑیاں اور نقلی نگوں والی انگوٹھیاں، گورا دمکتا ہوا روپ سروپ اور اوپر سے بیس بائیس کا سن۔ وہاب صاحب تو بری طرح مرمٹے۔ وہ پہلی نظر میں ہی فریفتہ ہوچکے تھے۔

''اللہ کے نام پر کچھ دیتا جا بابو......''

اتنے میں وہ خوب صورت نوجوان بھکارن ان کی سیکنڈ ہینڈ انیس سو چوراسی ماڈل کی سوزوکی کار کی کھڑکی کے پاس آگئی۔ وہاب صاحب نے گہری عقابی نگاہوں سے اس کا پھولوں جیسا نوخیز و ملائم سراپا جانچا۔

''کچھ، نہیں بہت کچھ دوں گا لڑکی۔ چلو آؤ، میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔'' ان کی آواز اور آنکھ کے اشاروں میں چھپے جذبے وہ پہچان گئی تھی۔

''نہ بابو نہ...... میں ایسے ہاتھ نہیں آنے والی۔ میری بے بے بڑی سخت ہے۔ وہ کہتی ہے مرد ذات کے ان بھروں میں نہیں آنا چاہیے۔ وہ پرنوچ کر رنگ چوس کر مرجھائی ہوئی تتلی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں۔'' وہ جیسے زمانوں کی ''سیکھی سکھائی'' تھی۔

وہاب صاحب نے ایک بار پھر نپے تلے انداز میں اس شعلہ بدن اور زرخیز دماغ والی ''بھکارن حسینہ'' کا جائزہ لیا۔ ''بول کیا مانگتی ہے؟ تجھے...... تیری اماں کو بلکہ تیرے سارے خاندان کو رکھوں گا۔ پورشن کرائے پر لے دوں گا شریفوں کے محلے میں۔ ہر مہینے معقول رقم بھی دیا کروں گا۔ چل میرے ساتھ اپنے جھونپڑے میں چل! وہیں تیری بے بے سے پوچھ لیتے ہیں۔'' اب وہ مان گئی۔ بے بے نے کچھ دیر تک سوچا پھر تحقیقی نگاہوں سے گرے تو پیس میں ملبوس کنپٹیوں سے سفید بالوں والے صحت مند اور توانا درمیانی عمر کے مرد کو تاڑنے لگی۔

''خیر سے کرتے کیا ہو میاں؟''

''میں سیٹھ وہاب ہوں، اپنی فیکٹری ہے میری۔'' سیٹھ وہاب کا لہجہ بارعب اور قدرے فخر آمیز ہوگیا۔

''اوہ......'' بڑھیا نے اب کے خاصی ملائمت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ ''چلو ٹھیک ہے مگر ہم پہلے چھمن میاں سے پوچھ لیں۔ رشتے میں میرا بھائی ہوتا ہے۔''

''یہ لو، کچھ پیسے رکھ لو......'' انہوں نے ہزار کے پانچ نوٹ گن کر الگ کردیے۔

''اپنے اور اپنی بیٹیوں کے ڈھنگ کے جوڑے خرید لو۔ شریفوں کے محلے میں ایسے فقیرانہ اور کارٹون نما لباس نہیں چلیں گے۔ تم لوگ سب سے یہی کہنا کہ تم نے اپنی بیٹی کو میرے ہاں نوکری پہ لگوایا ہے۔'' وہ اٹھ کر جانے لگے۔

''ٹھیک ہے۔'' بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نہ کہتی تھی میری شادو بڑی کام کی نکلے گی۔ ماں باپ کے دن پھیر دے گی۔'' وہ دل ہی دل میں اپنی بیٹی کی بلائیں لے رہی تھی۔

☆☆☆

بیرونی گیٹ کی بیل مسلسل بج رہی تھی مگر ہنوز کسی کو توفیق نہیں ہوئی تھی باہر جھانکنے کی۔

''نور...... اے نور! مادام نورالعین، نیچے اتر آیئے اور باہر جھانک کر آیئے ذرا......'' گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹے پاؤں کے ناخن تراشتے ہوئے نیچے لاؤنج میں بیٹھی اریشہ اپنی لاڈلی بھتیجی کو آوازیں دے رہی تھی۔

''کیا ہے پھپو، آپ خود بھی تو دیکھ سکتی ہیں نا! لے کے مجھے اوپر سے نیچے کا چکر لگوا ڈالا۔'' کچھ ساعت بعد جھلائے ہوئے انداز میں سیڑھیاں اترتی، سبز شلوار قمیص میں ملبوس، بھورے مائل سیاہ لمبے سیدھے بالوں کی پونی بنائے چودہ پندرہ برس کی نازک اندام گڑیا سی لڑکی کی ''انٹری'' ہوئی۔

''میری جان، ذرا زحمت کرلو۔ راحت بھابی تو پچھلے صحن میں چارپائی بچھا کر آرام کررہی ہیں۔ بھابا جی بھی گھر پر نہیں ہیں۔ میں ابھی پانچ منٹ قبل نہا کر نکلی ہوں کسی کے سامنے جانے کا حلیہ نہیں ہے۔ اس لیے تم دیکھ لو۔'' اس نے چمکارنے والے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے اس کی توجہ مسلسل بجتی ہوئی کال بیل کی سمت مبذول کرائی۔

''جی، میں دیکھ لیتی ہوں۔ بس یونہی جھنجلاہٹ سی ہورہی تھی۔ میٹرک کے پیپرز کی ٹینشن ہے نا۔'' اریشہ کے وضاحتی بیان نے نورالعین کو خجالت اور شرمندگی سے دوچار کردیا۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہہ کر بیرونی دروازے کی سمت گئی۔

''ایک ٹینشن کا حل دوسری ٹینشن لینے یا کسی دوسری چیز پر نکالنے سے نہیں ملتا۔'' اریشہ نے بڑے سبھاؤ سے کہہ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مزید کھسیا گئی۔

''لاحول ولاقوۃ...... میں سمجھی شاید کسی ''کوہ قاف'' سے مہمان تشریف لائے ہیں۔ خیر سے ڈاکیا تھا جو جان کو آگیا تھا۔ یہ رجسٹری آئی ہے آپ کے نام بھیجنے والے کا نام درج نہیں ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ برے برے سے منہ بناتے ہوئے ہاتھ میں رجسٹری تھامے بیزاری سی لاؤنج میں داخل ہوئی۔

''کیا ''کوہ قاف'' کے مہمان خصوصی طور پر تم سے ملاقات کا وقت طے کر گئے تھے؟'' رجسٹری اس کے ہاتھ سے لے کر کھولتے ہوئے اریشہ نے اپنی کم سن و نوخیز بھتیجی کو چھیڑا۔

''چھوڑیں پھپو آپ بھی بس۔'' وہ سر جھٹک کر کچھ جھینپ کر پھپو کو ٹوکنے لگی۔ پھر ایک دم کچھ خیال آجانے پر چونک کر اریشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ویسے سوئٹ پھپو، چانسز ضرور بن سکتے ہیں۔ پتا ہے کل پرسوں ایک عورت آئی۔ اتفاق سے صرف میں ہی گھر پر تھی۔ آپ اپنے سینٹر گئی ہوئی تھیں۔ امی بازار سے سودا خریدنے گئی تھیں اور بھابا جی حسب معمول آفس میں تھے۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ''آپ کی بڑی بہن کے سلسلے میں آئی ہوں میں اپنے بیٹے کے لیے۔ ماشاءاللہ چاند کا ٹکڑا ہے آپ کی بڑی بہن۔'' وہ تو میں نے بعد میں ان کی غلط فہمی دور کی کہ وہ میری بہن نہیں پھپو ہیں۔'' نورالعین اپنی

داستان سناتے ہوئے خود ہی محظوظ ہو رہی تھی۔

''ویسے اس میں ان کا کیا قصور، جو بھی پہلی بار ہم دونوں کو دیکھتا ہے، ہم بہنیں ہی لگتی ہیں اسے۔ اور خیر سے ہے بھی کافی حد تک سچ۔ امی بتاتی ہیں کہ جب ان کی اور بھایا جی کی شادی ہوئی تو اس وقت تمہاری اریشہ پھپو صرف پانچ سال کی تھیں اور دادی اماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایسے میں امی نے ہی پالا پوسا آپ کو...... سو آپ میرے لیے بالکل بہنوں کی طرح ہیں۔ مجھ سے فقط ایک ماہ کم چھ سال ہی تو بڑی ہیں۔''

''یہ تو بالکل بجا ہے، بھابی میرے لیے ماں کی طرح ہیں۔ انہی کی آغوش میں، میں نے ممتا کی گرمی اور پیار پایا ہے۔'' اریشہ نے بلا توقف تائید کی۔

''اب تم یوں کرو، نیچے اتر ہی آئی ہو تو تین کپ چائے بنالو۔ بھابی، میں اور تم بس تین ہی تو افراد ہیں۔''

''کون آیا تھا، بڑی دیر سے بیل ہو رہی تھی؟''

قدرے بھاری جسم کی ادھیڑ عمر عورت نرم و ملائم چہرے پر اداسی کے مخصوص تاثرات لیے بڑے پرسکون قدموں سے لاؤنج کی طرف آئیں۔ آنکھوں میں نیند...... بھری ہوئی تھی۔ چہرے پر ایک خاص وقار اور شفقت کا بھرپور تاثر جھلکتا تھا۔ یہ راحت العین تھیں، نور العین کی امی اور اریشہ کی بھابی۔

''ڈاکیا تھا امی اور کس نے ہونا تھا۔'' نور العین نے لاؤنج سے قریب ترین فاصلے پر بنے ڈائننگ روم کی ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے اپنی کم گو، سادہ اور شفیق ماں کو دیکھا۔

''مجھے یاد آیا، تمہارے بھایا جی بتا رہے تھے ان کے آفس میں نئی لڑکی اپائنٹ ہوئی ہے۔ اس کا گھر ادھر ہمارے ہی محلے میں ہے۔ نئے آئے ہیں یہاں...... گھر کا ایک پورشن کرائے پر لیا ہے۔ خاصے ضرورت مند ہیں۔ وہ بتا رہے تھے شاید ایک دو ہفتے بعد آئیں گے ہمارے ہاں۔ نہیں تو ہم لوگ ہو آئیں گے۔ یوں بھی پہلے ہمارا فرض بنتا ہے۔''

''سارے فرائض نبھانے کے لیے ہم ہی ہیں۔ کوئی ایک آدھ فرض ان پر بھی لاگو ہوتا ہے یا نہیں؟'' نور العین کے لہجے میں بلا کی تلخی اتر آئی تھی۔

''انہوں نے تو کبھی آپ کے جاننے، ملنے والوں کو درخور اعتنا نہیں جانا۔ مہمانوں کے سامنے عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ہمیں بھی اتنا اختیار نہیں دیا کہ اپنی مرضی سے کسی کو یہاں بلائیں یا کسی کے ہاں آ، جائیں۔ اپنے حلقۂ احباب کی سیوا کے لیے خود ہی ریوڑ کی طرح ہانک لیتے ہیں ہمیں۔''

راحت العین اس کی اس درجہ زہریلی صاف گوئی پر ششدر رہ گئیں پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اس پر ناراض ہونے لگیں۔

''کیا بدتمیزی ہے، باپ ہے تمہارا وہ۔ یہ سکھایا ہے میری تربیت نے۔ تمہاری تعلیم نے! کیسے منہ پھاڑ کر بولتی ہو۔ اریشہ سے بھی عقل نہیں سیکھی۔'' وہ برافروختہ ہوئیں۔

''ہیں نا مشرقی عورت، خاوند کی ہر جائز و ناجائز پر حمایت تو ضرور کریں گی۔ بھلے سے وہ ہستی کا سارا مان مٹی میں رول دے۔'' نور العین کے بے خوف لہجے کی کڑواہٹ راحت کو نیم جاں کرنے لگی۔

''دیکھ رہی ہو اریشہ تم؟'' انہوں نے صدمے سے چور انداز میں خاموش بیٹھی بال سلجھاتی اریشہ کی طرف نگاہ کی۔

''کبھی تو باپ بھی بولتا ہے۔ کتنی بے لگام اور ہٹ دھرم ہو گئی ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں وہ...... میری بے جا نرمی اور لاڈ پیار نے بگاڑا ہے اسے۔''

''جی ہاں، وہ تو ہر معاملے میں ٹھیک ہی کہیں گے قیامت تک۔'' نور العین سلگ کر کہہ گئی۔

راحت نے غضب ناک نظروں سے اپنی ضدی اور منہ پھٹ بیٹی کو دیکھا۔ وہ سرزنش کرنے کو تھیں کہ اریشہ نے ان کا بازو تھام کر تسلی دینے کے سے انداز میں تھپتھپایا اور نور العین کو کچن میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی

''کیوں پریشان ہوتی ہیں بھابی، ایویں تنگ کر رہی ہے آپ کو۔ اتنی اچھی سی تو ہے ماشاء اللہ اتنی سلجھی ہوئی، نفیس مزاج اور پختہ دماغ کی مالک ہے۔ بس باپ کے ''ہونے'' کو ترسی ہوئی ہے۔''

''بھایا جی کا اپنا ایک مزاج ہے، اپنی روٹین ہے۔ سب سے الگ تھلگ اور سب کے دکھ درد سے لاتعلق رہنا ان کی فطرت کا حصہ بن چکا ہے۔ آپ نے تو سہہ لیا اور سہہ رہی ہیں مگر وہ بچی ہے، کم عمر ہے، اس کمی کو پوری شدت سے تمام تر حسیات کے ساتھ محسوس کرتی ہے۔ یہ اس کا کمال ہے کہ اس ''اظہار'' کو من کے اندر ہی دبا کر رکھتی ہے۔ ہاں کبھی بے اختیار ہو ہی جاتی ہے۔ دل کی بات زبان پر لے آتی ہے۔ کبھی کبھی کی بے اختیاری تو قابلِ معافی ہو سکتی ہے نا، پھر وہ بہت کم سن ہے۔''

اریشہ بڑے طریقے سے نور العین کا مقدمہ لڑنے کے ساتھ ساتھ بھابی کو تشفی کرا رہی تھی۔ اس کے نرم سلجھے ہوئے رواں انداز پر راحت کے غصے نے ہتھیار ڈال دیے۔

''تم بھی بہت کم عمری میں ان بنیادی رشتوں سے محروم ہو گئی تھیں۔ پھر بھی اتنا جذب، تحمل اور برداشت ہے۔'' تھوڑا بہت غصہ بہرحال باقی تھا۔

''میری بات اور ہے بھابی۔'' اریشہ نے رہے سہے غصے کو بھی رفع کرنا چاہا۔ ''باپ کی طرف سے نور بہت محروم رہی ہے۔ آپ اپنی طرف سے تو اسے مکمل کر سیراب ہونے دیجیے۔'' اریشہ نے بہت سمجھائے انہیں، ان کی بے محل خفگی اور برہمی کا احساس دلایا تھا۔

''مرد بڑی مشکل چیز ہوا کرتا ہے اریشہ......! اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہو تو پھر عورت کی ساری عمر کانٹوں پر گھسٹتے ہوئے گزرتی ہے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ایک عمر سے ننگے پاؤں دوڑ رہی ہوں، ان کے پیچھے۔ کہ کہیں تو چالوں گی، کہیں تو تا کرا ہوگا۔ وہ غضب کا آسمان چھونے لگتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر۔ میں لاکھ حلیمی اور انکساری دکھاؤں، ان کے مزاج کی برف نہیں پگھلتی۔''

''اسی لیے تو نور اور میں آپ سے الجھتے ہیں۔ آپ کیوں عاجزی اوڑھ لیتی ہیں، چشم پوشی کا نقاب پہن لیتی ہیں، تابعداری لپیٹ لیتی ہیں، ملائمت کی بکل مار لیتی ہیں اور کچھ نہ سہی انسان دوسرے فریق کے ناروا سلوک کا احساس تو ہونے دے اس کو۔ اس طرح تو انہیں مزید شہ ملتی ہے۔'' راحت کے چہرے پر یاسیت جھلکنے لگی۔

''اریشہ...... میری جان، اب کیا سمجھاؤں تمہیں؟ سب کچھ تو کھلا ہے تمہارے سامنے۔ جس عورت کو شروع دن سے مرد کے دل میں جگہ نہ ملے، وہ چاہے جانے کے احساس سے لبریز ہو کر شوہر کے آنگن میں نہ اترے، وہ تا عمر شیشے سے زیادہ نازک فرش پر چلتی ہے۔ ہر لمحہ پھسل جانے، گر کر پیچھے رہ جانے اور بے بس ہو جانے کے واہمے ستاتے رہتے ہیں۔ جب قدم مضبوط نہ ہوں تو سر کیسے اٹھا رہ سکتا ہے۔ اسے جی حضوری کے لیے جھکانا ہی پڑتا ہے۔ رفاقت کے اتنے طویل برس گزر جانے کے باوجود نہ گھر کی چھت سائبان لگتی ہے، نہ زمین ٹھنڈک کا احساس دلاتی ہے۔ جو عورت عمر کی دو دہائیاں اپنے مرد کے ساتھ گزار کے بھی اس کے دل میں نہ چڑھ سکے۔ ان چاہی ہے۔ اس کے دل میں اور سوکھے پتے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہلکے سے جھونکے، کھٹکے پر کانپ اٹھتے ہیں۔ جس کو دل مسترد کر دے۔ اس کو سونے کے محل میں بھی شعلوں کی سی تپش محسوس ہوتی ہے۔ جگہ گر دل میں نہیں تو پھر کہیں نہیں اور میں وہ بدقسمت ہوں جو اپنی انتہا درجے کی نرم اور لچک دار عجز و انکساری سے بھرپور خو بو کے باوجود ہر طرح سے ''ان'' کی ماننے اور سن لینے کے باوجود ان کے لیے ''فالتو'' اور ''ناپسندیدہ'' ہوں۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ سر پرستی ''ان'' کے نام کی چھت چھن گئی تو کہیں کی بھی نہیں رہوں گی۔ مجھے ہر حال میں گھر بچانا ہے۔''

راحت نے اپنا دل کھول کے رکھ دیا تھا۔ اریشہ تو پہلے بھی اچھی طرح ''باخبر'' تھی۔ اس پر عجیب بے نام سی اداسی اور پژمردگی طاری ہو گئی۔

''میں چائے بنا لائی ہوں خواتین۔'' نور العین کپ بجاتی دور سے ہی اعلان کرتی آ رہی تھی۔

دونوں اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ اسی اثنا میں دوبارہ بیل بجی۔ جمعدارنی آئی تھی اپنا ''مہینہ'' لینے۔ راحت اس کے ساتھ بزی ہو گئیں۔ اریشہ اپنا کپ اٹھا کر اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''رجسٹری کس کی ہے پھپو؟'' نور العین اکیلے کیسے بیٹھی رہ سکتی تھی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی اور یونہی تجسس دور کرنے کو پوچھ بیٹھی۔

''میرا سبجیکٹ ہے نا اسپیشل ایجوکیشن، اس کے متعلق

مجھے کچھ معلومات چاہیے تھیں۔ عاصم سے کہا تھا معذور افراد کے متعلق کچھ ضروری ابلاغی معلومات ڈھونڈ کر پہنچادے۔ گھر تو خود نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے پوسٹ کردیا۔“

”عاصم کون ہیں؟“ نورالعین کے دل میں فطری اشتیاق جاگا۔

”تم نہیں جانتیں؟“ اریشہ نے ایک لمحے کو اس کا چہرہ دیکھا۔ ”بتایا تو تھا تمہیں، میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ کالج کے زمانے میں۔ بی اے کے بعد وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گیا۔ قسمت نے یاوری کی اور اے سی بن گیا۔ مزے میں ہے خوب! مجھ سے خود ہی رابطہ رکھتا ہے۔ ملاقات وغیرہ تو بس اتفاقی اور ”حادثاتی“ سطح پر ہی کبھی کبھار ہوتی ہے۔ ”فارمل“ ہونا پڑتا ہے نا، اسے اپنے عہدے کے حساب سے۔ فون دینا مجھے، اس کا شکریہ بھی ادا کردوں۔ پتا نہیں ملتا بھی ہے لائن پر یا نہیں۔“

اس کو فون سیٹ پکڑاتے ہوئے نورالعین نے نوٹ کیا یکایک اریشہ کے چہرے پر بشاشت اور آنکھوں میں ایک مسکراتی سی جھلملاہٹ در آئی تھی۔ جیسے اچانک ہی بہت موڈ میں آگئی تھی۔

”ہیلو، اے سی عاصم بخاری سے بات ہوسکتی ہے؟“ رابطہ ملنے پر اریشہ نے مہذبانہ انداز میں کہا۔

”اوہ...... زہے نصیب۔“ ایک شوخ آواز ماؤتھ پیس پر چھا کر جیسے اردگرد کے سارے مناظر نکھار گئی تھی۔ ”پیرو مرشد ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتے مگر تھوڑا تھوڑا شک ہونے لگا ہے۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ”مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے“، ادھر تمہارے دل سے فریکوئنسی مل گئی اور تم نے یاد کرلیا۔ شکریہ، نوازش۔ تمہارا رخِ روشن نہ سہی آواز ہی سہی۔ دل بہلانے کو دیوانوں کے لیے اتنا بھی بہت ہے۔ فرمایئے، عرض کیجیے۔ حکم ارشاد۔“ ادھر سے جیسے روئیں روئیں سے شوخی و شرارت اور سرخوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

اریشہ میں اعتماد تو بہت تھا مگر فطرتاً شرمیلی تھی پھر اس بھرپور ”چھیڑ خانی“ کرتے شوخ مرد کے آگے تو ویسے بھی آسانی سے زیر ہوجایا کرتی تھی۔ سو اس وقت بھی حیا سے کٹ کر رہ گئی۔ پھر کچھ نورالعین کی موجودگی کا بھی احساس تھا۔ جو ایک ٹک پھپھو کے دمکتے قوس قزح سے دمکتے بہار آفریں چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔

”توبہ ہے، تمہارا راگ ایک بار پھر چھڑ جائے تو بند ہونا محال ہوجاتا ہے۔“ وہ فطری حجاب کو جھنجلاہٹ اور خفگی میں چھپا کر بولی۔ ”میں نے شکریے کے لیے فون کیا تھا۔ تمہارا بھیجا ہوا مواد مل گیا ہے مجھے۔“ اس نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی مبادا وہ پھر اپنی جون میں آجائے۔

”ہم نہیں وصولتے ایسا ”روکھا پھیکا“ شکریہ!“ شوخ لہجے سے حد درجہ شرارت ہویدا تھی۔

”کیا مطلب اور شکریہ کیسا ہوتا ہے؟ گھی مکھن میں تر ہوتا ہے کیا؟“ وہ اس کی شرارت نہیں سمجھی سادگی سے الجھ کر پوچھ ڈالا۔ عاصم کو بے ساختہ گدگدی ہوئی۔

”نہیں، پیار محبت کے شیرے میں لپیٹ کر ادا کیا جاتا ہے عملاً۔“ ادھر سے برجستہ جواب دیا۔ کیا ذومعنی انداز تھا۔ وہ سمجھ کر بری طرح سٹپٹا گئی۔

”کیا بدتمیزی ہے؟“ وہ چاہنے کے باوجود لہجے میں خفگی پیدا نہ کرسکی۔ عجیب مغلوب سی مدھر کیفیت اس کے گرد حصار باندھ گئی تھی۔

کچھ محاذوں پر انسان کوشش کے باوجود ہار جاتا ہے۔ غالب رہنے کی شعوری جدوجہد کرتے ہوئے انا کی تسکین تو ضرور ہوجاتی ہے مگر فتح پھر بھی ہاتھ نہیں آتی۔ پھر اس کے مقابل ایسا جذبوں بھرا، جوشیلا، جنون خیز بھرپور مرد تھا جو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ مخاطب کو دو منٹ میں دام میں کرلینا اس کا نمایاں وصف تھا۔

”الزام ہے سراسر ہم پر، کہاں کرتے ہیں بدتمیزی ہم... اور تم ہاتھ بھی کب آتی ہو؟“ ادھر سے مسکراتے ہوئے لہجے میں احتجاج برآمد ہوا تھا۔

”سنو، کیوں نہ ”عثمانیہ“ میں لنچ کرلیں اکٹھے۔“ وہ ستانے سے باز نہیں آیا۔

”کیوں نہیں، ساتھ میں بھایا جی کو بھی شامل کرلینا۔ میرا روسٹ تو وہ بڑا اچھا بنادیں گے اور اپنے پسٹل کے ذریعے......“ وہ جل کر خاک ہوگئی۔ ادھر سے بے ساختہ

قہقہہ ابھرا تھا۔

”نہیں بھئی، اتنی جلدی نہیں۔ ابھی ہم دنیا کو کچھ اور دیکھنا چاہتے ہیں۔“ وہ بڑے آرام سے بولا۔

”میرے مرنے کے بعد بھی تم پر پابندی نہیں ہوگی دیکھنے کی۔“ وہ چڑ کر گویا ہوئی۔

”تم مروگی تو تمہارے ساتھ ہمیں بھی مرنا پڑے گا لامحالہ کہ عاشقوں کے قبیلے کی روایت رہی ہے۔ جس پہ مرنا اسی پہ مرنا۔“ بڑی بے چارگی سے کہا گیا۔

”اور بھی بھی، ڈوب کر مرنا......“ وہ اس کے جان جلانے والے انداز پر اس کا جملہ اچک کر بے اختیار ٹکڑا لگا گئی کہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا ”فل اسٹاپ“ لگانے کا۔

”اچھا......“ وہ اس کے کوفت بھرے انداز پر بے اختیار ہنسنے لگا پھر سنجیدگی سے بولا ”یار تمہیں بتانا تھا مجھے، میرے ایک دوست ہیں یا سمجھو جاننے والے ہیں انہوں نے معذور افراد کے لیے ایک سینٹر کھولا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان افراد کے لیے رہائشی ایریا بھی ہے۔ یوں سمجھو ہاسٹل کی طرح کا ماحول ہے اور اسی کے ساتھ معذور بچوں کے لیے ایک چھوٹا سا اسکول بنایا ہوا ہے۔ اس پورے پراجیکٹ کو اس نے ”سانجھ نگر“ کا نام دے رکھا ہے۔ پراجیکٹ کا کچھ حصہ ابھی زیر تکمیل ہے۔ ایک چھوٹا سا اسپتال اور تفریحی پارک بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ہینڈی کیپڈ افراد کے متعلق اسٹڈی کے لیے ایک ریسرچ سینٹر قائم کرنے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔ انہیں ایک لیڈی ایڈمنسٹریٹر کی ضرورت ہے۔ میل ایڈمنسٹریٹر، جنرل منیجر، ریسپشنسٹ، پی آر او سب آسامیاں پر ہوچکی ہیں۔ اس ایک کے علاوہ۔“

”ادارے کا سربراہ کون ہے اور تم کیسے جانتے ہو؟“ ”سانجھ نگر کی تفصیلات اور خصوصیات“ سن کر اریشہ کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ اس نے بہت دلچسپی سے دریافت کیا۔

”خواجہ طارق عثمانی ہیں۔ بڑے بردبار بزرگانہ شخصیت کے مالک ہیں۔ ساٹھ کی دہائی کراس کرچکے ہیں۔“ بولتے بولتے وہ حسب عادت پٹڑی سے اتر گیا۔ لہجے میں شرارت گھل گئی۔

”آگے چلو۔“ وہ زچ سی ہوکر بے صبری سے ٹوک گئی۔

”کہاں چلوں؟ ہر راستہ تم پر ختم ہوتا ہے۔ چٹان بن کر سامنے آجاتی ہو۔ جسے توڑتے توڑتے بندہ خود ہی ریزہ ریزہ ہونے لگتا ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے لی۔

اریشہ کا اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہنے لگا۔ جتنی اسے بے قراری تھی اتنا ہی وہ ستا رہا تھا۔

”بھئی وہ ”فیتہ“ کاٹنے کی تقریب آپ کے اس عاشق نامدار کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی اس لیے یاد رہ گیا۔ تمہاری دلچسپی کے خیال سے پوری انفارمیشن لے لی۔ اب بتاؤ، کیا ارادے ہیں؟“

”ارادے تو نیک ہیں۔“ وہ سوچ کر بولی ”میں ایک بار ”سانجھ نگر“ دیکھ لوں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ ہے کہاں پر۔“

”پنڈی میں ہی ہے، ادھر میری رہائش گاہ سے تو خاصا قریب ہے پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہوگی بہ مشکل۔ مگر تمہیں اسلام آباد سے خاصا دور پڑے گا اور راستہ کچھ اس طرح کا ہے کہ تم پہلی بار میں خود سے شاید ہی پہنچ سکو۔“

”ہاں، پنڈی کے راستوں کا تو مجھے ویسے بھی کوئی خاص علم نہیں۔“ اس نے پریشانی سے اعتراف کیا۔

”تم کہو تو میں تمہیں لے چلوں؟“ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر گزارش کر بیٹھا۔

”مگر کیسے...... میرے گھر تو آنے سے رہے۔ بھایا جی کو پتا چل گیا تو علیحدہ مصیبت پڑ جائے گی۔ وہ تو ویسے بھی مزاجاً بہت سرد اور کرخت ہیں۔“ اس نے مایوسی اور تشویش کے ملے جلے انداز میں اپنی فکر ظاہر کی۔

”ڈزن میٹر، تم مجھے اسلام آباد کا کوئی اسٹاپ بتادو۔ وہاں سے پک کرلوں گا۔“ دید کے طالب، بے تاب دل نے فوراً راہ نکال کر گویا پیش کردی۔

”ہاں، یہ ممکن ہوسکتا ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے متفکرانہ لہجے میں بولی۔

”تو بس ٹھیک ہے۔ میں کل صبح دس بجے تمہیں پشاور موڑ کے پاس ایک اسٹال کے قریب سے پک کرلوں گا۔“ اس نے موقع پاتے ہی اریشہ کی مزید ردوکد سے بچنے کے

لیے فوراً لائحہ عمل سیٹ کر لیا۔

اریشہ کچھ دیر مخمصے کا شکار رہی۔ وہ سوچوں کے تانے بانے بن رہی تھی۔

"بولو بھئی...... کیا سو گئیں......؟" اس کی بے تابی حد سے سوا تھی۔

"ہوں!" اریشہ نے بے دھیانی سے چونک کر کہا اور پھر گہری سانس لے کر بالآخر فیصلہ کر ڈالا۔ "ٹھیک ہے مگر سنو وقت پر پہنچ جانا۔ میں اسٹاپ پر زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اتنے لوگ ہوتے ہیں وہاں۔"

"تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، میں انشاء اللہ نو بج کر پچاس منٹ پر وہاں بک اسٹال کے پاس ہوں گا۔ اپنی "نشانی" بتا دوں یا صورت یاد رہے گی۔" آخر میں وہ پھر شریر ہو گیا۔

"بے فکر رہو، ہمارے ہاں چھچھوری کی بہت زیادہ اقسام نہیں پائی جاتیں۔ لامحالہ تمہیں پہچان ہی لوں گی۔" اس نے برجستہ کہہ کر بڑی دیر کا رکھا حساب چکا دیا۔

"ہم اس کا "تفصیلی" جواب دیں گے کل جب وقت اپنی کمانڈ میں ہوگا۔ فی الحال ادھار رہا۔" ادھر سے گمبھیر سے شرارتی انداز میں کہا گیا۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ توبہ ہے، حرفوں سے بنا ہوا ہے۔ بات بات پر دل دھڑکا دیتا ہے۔ "بندہ اپنے عہدے کی لاج ہی رکھ لے۔" وہ پیش بندی کے طور پر اس کے معتبر اور معزز قسم کے عہدے کا احساس دلانے لگی۔

"کیا کیجیے، دل کی بے اختیاری اپنی جگہ...... اور حصول رزق و زر اپنی جگہ۔" اس نے سرد آہ کھینچی بڑے دل دوز اور غمگین انداز میں۔

اور اس نے بہت سریلے سُروں میں ہنستے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

"پھپھو، یہ آپ ہی تھیں نا؟" حیرت سے گنگ ٹکر ٹکر دیکھتی نور العین کے لیے اس کے چہرے پر اترتی رنگوں کی برسات قطعی اجنبی تھی۔

"تمہیں کس پر حیرت ہو رہی ہے؟" اریشہ اس کے گالوں میں چٹکی بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی کے پردے ہٹانے لگی۔ "جاب تو مجھے بہر حال کرنا ہی تھی، ایک نہ ایک دن۔"

"جاب والی بات پر تو بعد میں حیران ہوا جا سکتا ہے فی الحال تو جاب دلانے والے کے رویے پر حیرت سے مرنے کو ہوں۔ پہلے کہاں چھپے ہوئے تھے یہ عزیز...... آپ نے تو کبھی ان سے اس درجہ گہرے مراسم کے بارے میں نہیں بتایا۔" وہ استعجاب کی انتہا پر کھڑی اریشہ کا چہرہ ٹٹول کر کچھ "اخذ" کرنے کے چکر میں تھی گویا۔

"ارے، ایسے بھی کوئی خاص نہیں۔" اریشہ یونہی بات ٹالنے کی بے پروائی سے بولی۔

"یہ مان، یہ اعتماد، یہ لگاوٹ۔ غیر ممکن ہے کہ آپ کے خاص نوعیت کے مراسم نہ رہے ہوں۔ خوشی اور سرشاری کے یہ رنگ تو اپنے سے قریب ترین لوگوں سے ملنے یا بات کرنے سے پھوٹتے ہیں۔"

نور العین ششدر کھڑی آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی جو ذہن میں آنے والے دن کے متعلق لائحہ عمل ترتیب دینے میں مگن تھی۔

☆☆☆

"اے چھمن میاں، کہنے کو تم بھائی ہو مگر کام آج تک نہ کیا سکھ پہنچانے والا۔ کتنے برسوں سے ساتھ ہو مگر کیا بنایا یا کیا۔"

"نجو بی، تم کو تو عادت ہے دکھڑے رونے کی۔" چھمن میاں کان کھجاتے ہوئے کھسیا کر بولے۔ "اپنی لونڈیا کی نوکری ہو گئی ہے سیٹھ وہاب کے ہاں...... اس کے کارن تو آج اس جوگے ہوئے ہیں کہ اس شاندار محلے میں گھر مل گیا ہے۔ ورنہ سڑتے رہتے وہیں کچی آبادی میں۔ ارے، عیش کے دن تو اب آئے ہیں۔ تو کیوں دل برا کرتی ہے۔" چھمن میاں نے پان کی پچکاری فرش پر ماری۔

"اے ہے کیا کر دیا کم بخت، سارا فرش گندا کر دیا۔ ابھی وہ چھوکریاں آ گئیں تو آسمان سر پر اٹھا لیں گی۔ اچھے گھر میں آیا ہے تو کچھ سلیقہ بھی سیکھ لے۔" خضاب لگے کھچڑی بالوں والی تیز مزاج سی بڑھیا جسے چھمن میاں نے نجو بی کہہ کر مخاطب کیا تھا گویا ان پر الٹ پڑی تھی۔

"پرانی عادت چھٹتے چھٹتے ہی چھٹے گی۔" چھمن میاں

نے کیڑا لگے دانت نکالے۔ "ہاں، کیا کہہ رہی تھیں تم
بھلا؟" انہوں نے دوبارہ سے نجو بی کو سلسلہ کلام جوڑنے پر
راغب کیا۔ جواب میں بڑھیا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر
گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"اے کیا کہنا کہلاتا، میری تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی
ہیں۔ دو پتھر کی سلیں دھری ہیں میرے سینے پر۔ کون آئے
گا نہیں بیاہنے۔ کہاں سے ڈھونڈوں گی بر۔ اے میں تو
ادھ موئی ہو جاتی ہوں سوچ سوچ کر، بیٹا بھی دیا اللہ نے تو
سب سے آخر میں۔ وہ تو صرف آٹھ سال کا ہے ابھی۔"

"اے میں جو موجود ہوں نجو بی، کیوں فکر کرتی ہو؟"
چھمن میاں نے اپنی چھاتی پھلا کر کہا۔

"اے بس کر، تیرے بھرتے میں نہیں آنے کی۔"
بڑھیا نے بیزاری سے کہا۔

"میں تو سوچ رہی ہوں بھلے بچیاں دونوں گھر پہ
رہیں۔ چھوٹا رفیقا بھی اسکول جاتا رہے تو اور میں دن کو
"دھندے" پر نکل جایا کریں۔ برقع پہن کے یہاں سے
نکلوں گی تو کون پہچانے گا۔ واپس آکر بھکاریوں والا چولا
اتار کر دوسرے کپڑے پہن لیے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا
اور ہمارا خرچہ پانی بھی نکلتا رہے گا۔" نجو بی نے سرگوشی
میں بڑے پتے کی بات کہی۔

"لیکن خرچہ پانی سیٹھ جو دیتا ہے۔" چھمن میاں نے
کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بہن کو دیکھا۔

"ارے نامراد، کیا صرف "خرچ پانی" تک ہی محدود
رہنا ہے۔" بڑھیا نے دانت پیستے ہوئے اسے ایک ہاتھ
رسید کیا۔

"دونوں لڑکیوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ میں اپنی
"برادری" میں تو ہرگز نہیں کروں گی۔ کوئی کام کاج والا
اچھا بر دیکھوں گی۔ میں نہیں چاہتی میری بیٹیاں بھی میرے
جیسا کالا نصیب لے کر تیرے میرے کے آگے ہاتھ
پھیلاتی رہیں۔ بھئی، میں تو کل سے دھندے پہ جایا کروں
گی۔" نجو بی نے فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

"یہ آپ ہیں تو آپ پر قربان جائیے۔" عاصم نے
اس کے قریب گاڑی روکتے ہوئے شوخی سے اس کا سراپا
دیکھا، وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"عاصم، بدتمیزی نہیں پلیز......" وہ شرمیلے سے انداز
میں سرزنش کر رہی تھی۔

ہلکے گلابی اور گہرے آتشی گلابی رنگوں کی لائننگ والی
شرٹ پر ہلکا گلابی دوپٹا اور شلوار زیب تن کیے اریشہ بہار
کے تازہ جھونکے کی طرح عاصم کے اعصاب پر اثر انداز
ہوئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ آتے ہی آس پاس کے
ماحول پر چھا گئی ہو۔ عاصم کی نگاہ پُرشوق نے اس گل رخ کا
طواف کیا اور جیسے وہ نگاہ سیر سی ہو گئی۔

"سامنے دیکھ کر گاڑی چلائیں مسٹر......" وہ جھینپی جھینپی
سی مسکراہٹ لیے فہمائش کر رہی تھی۔

"آئے ہو میری زندگی میں تم بہار بن کے۔" وہ شریر
نظروں سے دیکھتا ہوا گنگنانے لگا۔

"سنو، پہلے میں تمہیں "سانجھ نگر" لے چلوں گا اور
وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے گھر...... جہاں میرا
ایک شرارتی سا چھوٹا بھائی اور شفیق سی دادی اماں تمہارا
انتظار کر رہی ہیں۔"

"مائی گاڈ! عاصم ہرگز نہیں۔" اس نے عجلت میں اس
کی بات کاٹی۔ "ایک تو یہ کہ یوں تمہارے گھر جانا قطعی
مناسب نہیں لگتا۔ دوسرے میں تمہارے گھر والوں کا سامنا
کیسے کروں گی۔ آئی مین کس رشتے سے......؟" وہ تو گھبرا
ہی گئی تھی۔

"کس رشتے سے؟ ارے بھئی یہ سالم ثبوتا رشتہ جو
ہوگا تمہارے ساتھ۔" عاصم نے پُرسکون مسکراہٹ لیے
اپنی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں بھئی...... بس تم مجھے ادارے سے واپسی پر
سیدھا گھر چھوڑ دینا۔ میں تمہارے ہاں نہیں آسکتی۔" وہ
متردد رہی اور عاصم مسلسل مصر رہا۔

طارق عثمانی سے مل کر اریشہ خوشگوار جذبات سے
دوچار ہو گئی۔ وہ بلاشبہ انسانیت نوازی، نیک دلی اور اپنے
کام سے حد درجہ لگن کا عملی نمونہ تھے۔

"میں ایک کامیاب بزنس مین رہا ہوں۔ بہت پیسہ
کمایا۔ خدا نے ایک ہی اولاد دی، وہ بھی معذور بیٹا جو پندرہ
سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کے بعد دنیاوی جھمیلوں

سے دل اکتا گیا۔ میں نے اور میری بیوی نے خود کو فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دیا اور اس کے لیے معذور افراد کی خدمت، بہتری اور ان کی صحت و تعلیم کے شعبے سے زیادہ اہم اور حساس کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ "سانجھ گھر" ہمارے خوابوں کی تعبیر بن کر ایک نقشے سے وسیع و عریض عمارت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد یہ پراجیکٹ پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ آپ چونکہ اسپیشل ایجوکیشن کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ہمیں یقین ہے کہ آپ کی ہماری ٹیم میں شمولیت ادارے کے بچوں کے لیے بہت سودمند ثابت ہوگی۔"

اریشہ کو طارق عثمانی صاحب کا سادہ، کھرا اور دوٹوک طرز گفتگو بہت اچھا لگا۔ "انشاء اللہ سر، آپ بتایئے میں کب سے جوائن کروں؟"

"آپ کل ہی تشریف لے آیئے۔ میں آپ کا اپائنٹ منٹ لیٹر بنوا دیتا ہوں۔"

"شکریہ سر۔" اریشہ کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا تھا۔

تعلیم مکمل کر کے جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اس کا اولین مقصد اور شدید خواہش تھی۔ وہ بھایا جی کے بدلے تیور کافی عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے رویے کے پیش نظر روز بروز اس کے اندر یہ تمنا جڑ پکڑتی جا رہی تھی کہ وہ کم از کم اپنا بوجھ خود اٹھا لے۔ بھایا جی باتوں باتوں میں اپنے مخصوص جھلائے ہوئے خشک اور اکھڑ لب و لہجے میں اکثر ہی راحت بھابی کے تقاضے پر باتیں سناتے تھے۔

"میں تنگ آ گیا ہوں تمہارے روز روز کے اس بھیک منگے انداز سے۔ آج یہ ختم ہو گیا، کل وہ ختم ہو گیا۔ اس کے کپڑے لانے ہیں، اس کے جوتے دلانے ہیں۔ اس کی فیس، اس کی فیس، یہ بل، وہ بل۔ کب ختم ہوں گے یہ جھنجٹ۔ پیسے کیا درخت سے توڑ کر لاتا ہوں! اتنا کر کے بھی وہی حال ہے۔ اتنی مشکلوں سے اس گھر کی قسطیں پوری کر کے مالک مکان سے اپنے نام الاٹ کرایا ہے۔ قسطوں پہ گاڑی خریدی ہے۔ اب میں کوئی کروڑ پتی تو نہیں ہوں کہ ادھر بیگم صاحبہ یا بچے فرمائش کریں اور ادھر بینک سے ایک آدھ لاکھ روپیہ منگوا کے ہتھیلی پر رکھ دوں! محنت کر کے پائی پائی جوڑتا ہوں۔ باپ نے تو ورثے میں چند گز کا ٹکڑا بھی نہ چھوڑا تھا۔ یہ سب تو میری شبانہ روز محنتوں کا پھل ہے۔"

اریشہ اپنے کمرے میں سر جھکائے سب سنتے ہوئے ہاتھوں کی لکیروں میں جانے کیا کھوجتی رہتی تھی۔ کہتے وہ بھائی سے تھے مگر ان کے لفظ ہتھوڑا بن کر اریشہ کے دل پر لگتے تھے۔

"کس سوچ میں گم ہو اے حسین، ماہ جبین، نازنین!" واپسی پر عاصم نے ٹہوکا دے کر اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ گہری سانس لے کر سوچوں کے بھنور سے باہر نکلی۔

"میں عثمانی صاحب کی شخصیت کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ کیسی خوش اخلاق اور نرم و ملائم طبیعت پائی ہے۔ اتنا پیسہ، عوامی سطح پر اتنا نام، تعلیمی سطح پر بے شمار ڈگریوں کا اعزاز اور فطرت میں کیسی انکساری، وقار اور حلاوت ہے۔ اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی شخصیت کی بے نیازی اور قناعت پسندی بڑی قابل تحسین ہے، ہے نا؟"

"اب اتنی تعریفیں بھی نہ کرو کہ میں جیلس ہو جاؤں۔" عاصم نے مصنوعی فکرمندی کا اظہار کیا۔

"کم آن۔" اریشہ کی نگاہوں میں تادیب سمٹ آئی۔ "وہ ایک بزرگ اور محترم ہستی ہیں، سمجھے۔"

"سمجھ گیا محترمہ۔" وہ ترنگ میں ڈرائیو کر رہا تھا۔

"ارے یہ کیا...... تم کہاں لے آئے مجھے؟"

سرسبز احاطے سے منسلک سفید اور سبز ٹائلنگ والی آٹھ مرلے کی دیدہ زیب کوٹھی کے عین آگے عاصم نے گاڑی روک دی تھی۔

"میں ہرگز نہیں اتروں گی عاصم، چیٹر کہیں کے......" وہ روہانسی ہو گئی۔ "تمہارے گھر والے کیا خیال کریں گے۔ اور...... اور...... دادی اماں۔"

"زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے نا کہ لڑکی آپوں آپ خود کو پسند کروانے پہنچ گئی ہے۔" وہ شریر انداز میں مسکرایا۔

"عاصم!" اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ "میں نہیں جا رہی۔" وہ بالآخر اکڑ کر اپنی سیٹ پر جم گئی۔

"بیٹھنے کی نہیں ہو رہی مادام، آجایئے ورنہ خادم کو بہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر اتارنا پڑے گا۔" وہ فوراً خوف زدہ ہو کر گاڑی سے باہر آگئی۔

"تم بہت "وہ" ہو عاصم۔" وہ اندر ہی اندر گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"جو بھی ہوں، آپ کا ہوں مادام!" وہ نچلا لب شرارت سے ہونٹوں تلے دبا کر کورنش بجا لایا۔ "آیئے، تشریف لایئے۔ تم آ گئے ہو، نور آ گیا ہے ورنہ ستاروں سے لو جا رہی تھی۔" اور اریشہ کو جائے بنا چارہ نہیں رہا۔

"آؤ بیٹی، آرام سے بیٹھو۔ ادھر صوفے پر۔ گھبراؤ نہیں یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

اس کے اندازوں کے برعکس عاصم کے گھر والے بڑی محبت اور اخلاق سے پیش آئے تھے۔ سفید نرم روئی کے گالوں جیسے بال اور سرخی مائل جھریوں بھرے شفیق چہرے پر مہربان سی مسکان لیے دادی اماں جارجٹ کے نفیس سوٹ میں وقار اور شفقت کا مرقع لگ رہی تھیں۔

"جی ہاں، ابھی اعزازاً اور بعد میں یہ "سرکاری" طور پر آپ کا اپنا ہو جائے گا۔" بلیو جینز کی پینٹ پر بلیو جینز کی شرٹ پہنے عاصم کی شباہت کا مگر اس سے قدرے دبلا شریر آنکھوں والا نوجوان یقیناً عاصم کا چھوٹا بھائی عاطف ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بڑی برجستگی سے دادی اماں کی بات پکڑ کر ٹکڑا جوڑا تھا۔

"اریشہ تعارف کی ضرورت تو نہیں رہے گی نا؟" عاصم نے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"بالکل نہیں کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔" عاطف نے فوراً کھٹ سے جواب داغا۔

اریشہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

"یہ دادی اماں ہیں اور یہ عاطف، اتنا کافی ہے نا۔" عاصم نے پھر نرمی سے اریشہ کو مخاطب کیا تھا۔

"جی....." وہ مسکرا دی "میرا خیال ہے بہت کافی ہے۔"

"اور یہ ہماری ہونے والی بھابی، اریشہ..... اتنا کافی ہے نا۔" عاطف نے چھیڑ خانی کا آغاز بڑی دھوم دھام سے کیا تھا۔ اریشہ کٹ کر رہ گئی۔ عاصم کی دلفریب مسکراہٹ اور آنکھوں کے شرارے اریشہ کی رہی سہی خود اعتمادی کو بہا کر لے گئے۔

"ارے چھوڑو بھی، کیوں بچی بے چاری کو تنگ کر رہے ہو۔ بیٹا کیا لوگی۔ ٹھنڈا یا گرم؟" دادی اماں نے پوتوں کو ڈپٹا۔

"گرم چائے مگر ٹھنڈی کر کے۔" عاطف نے زنانہ آواز نکالی۔

"ٹھہرو تو......" دادی نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے پوتے کی خبر لی۔

"ان صاحب کا پسندیدہ کام فلم بینی ہے۔ ہالی ووڈ، بالی ووڈ، لالی ووڈ کہیں کی فلمیں نہیں چھوڑتے۔ سب دیکھتے ہیں حتیٰ کہ سینما بھی بڑے شوق سے جاتے ہیں۔ فلموں پر تبصرہ نگاری کے لیے ان سے زیادہ موزوں مبصر آپ کو کہیں نہیں مل سکے گا۔" عاصم نے صوفے پر نیم دراز ہونے کے انداز میں براجمان ہو کر محبت سے اپنے بھائی کا مشغلہ بتایا تھا۔

"ہمارے ملک کی فلموں میں نقص نکالتا ہے! دوسروں کی فلموں کی تعریف کرتا ہے، غدارِ وطن!" عاصم نے فلمی بڑھک ماری تھی۔

"اللہ کا شکر ہے میں ایک محبِ وطن اور جاں نثار شہری ہوں۔ اپنے ملک پر ایک ذرا سی آنچ آتے نہیں دیکھ سکتا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ محض انڈسٹری کی بہتری اور ترقی کے لیے اگر مثبت موازنہ کیا جائے تو اس سے حب الوطنی کے جذبات مجروح ہوں گے۔ ویسے بھی امید کا دامن تھامے رہنا چاہیے۔" عاطف کے پاس ہر بات کا جواز تھا۔

"مگر تم سے بندھی امیدیں ضرور ٹوٹ گئی ہیں۔ کام کے نہ کاج کے اور دشمن فلموں کے......" عاصم نے اس کا قافیہ تنگ کیا۔

"میں بس ابھی گیا اور ابھی آیا......" عاطف اپنے ذمے لگایا گیا کام نپٹانے کو اٹھا۔

"اب رہنے دو بھیا، سب کچھ ریڈی ہے۔" اسی اثنا میں دادی اماں بشیراں کے ہمراہ آگئیں۔ بھری ہوئی ٹرالی دیکھ کر اریشہ خفا ہونے لگی۔

"یہ کیا دادی اماں، اتنا تکلف! جیسے دس بندوں کی دعوت کی گئی ہو۔"

"ارے بھئی، ہم نے اپنے دل کی خوشی کے لیے کیا ہے۔ ہمیں تمہاری آمد، تمہارا انتظار اور تمہاری خاطر تواضع سب بہت اچھا اور اپنائیت آمیز لگا ہے۔" دادی اماں محبت سے مسکرائیں۔

اریشہ کو سادگی اور پیار سے بھرپور ماحول میں وقت گزارنا بہت پرلطف لگا تھا۔ جاتے سے عاطف نے اسے ایک سی ڈی دی۔

"یہ ایک کلاسیکل مووی ہے اور اس میں محبت کو جس رنگ میں دکھایا گیا ہے وہ ناقابلِ بیان حد تک سحر انگیز اور روح پرور ہے۔"

اریشہ نے الٹ پلٹ کر نام دیکھا "دیوداس۔" "نام تو میں نے کافی سنا ہے چلو میں دیکھوں گی، شکریہ۔"

"ایک منٹ۔" عاطف نے جلدی سے غلط فہمی دور کر دی "میں نے یہ سی ڈی ادھار دی ہے۔ دیکھ کے واپس کرنا ہو گی، ڈن۔"

"اوکے۔" وہ کھل کر مسکرا دی "میں دیکھ کر واپس لے آؤں گی۔"

"کیسا لگا تمہیں میرا گھر اور گھرانا؟" اسے ڈراپ کرتے ہوئے عاصم نے دریافت کیا تھا۔

"بہت اچھا۔" اس نے خلوص اور سچائی سے جواب دیا۔ "وہ اپنی مثال آپ قسم کے لاجواب لوگ ہیں۔"

"اور میں......!" عاصم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اوہ......" وہ ناز سے ٹھینگا دکھاتی تیز تیز قدموں سے روڈ کراس کرنے لگی۔

☆☆☆

"یہ طاہر کہاں ہوتا ہے آج کل......؟" بھایا جی راحت بھابی پر بگڑ رہے تھے۔

"وہ...... اپنے دوستوں کے ساتھ ہو گا۔" وہ آہستگی سے صفائی دینے لگیں۔

"لاحول ولا قوۃ! کون سے دوست۔ راحت العین بیگم آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھی بنی بیٹھی ہیں۔" انہوں نے دانت پیسے۔

"وہ نواب زادہ اپنی عمر سے بڑے لونڈوں لپاڑوں کے ساتھ غل مچاتا پھرتا ہے۔ طیب صاحب شکایت کر رہے تھے کہ دو مرتبہ محلے کی لڑکیوں کو چھیڑنے کی وجہ سے مار کھا چکا ہے۔ اس کے ماسٹر صاحب نے اسے اسکول کے پچھلے گراؤنڈ میں کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر سگریٹ نوشی کرتے دیکھا تھا۔ اس دن اسکول میں بلوایا تھا۔ میں گیا تو اس کے کلاس ٹیچر نے خاص طور پر مجھ سے علیحدگی میں بات چیت کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اس بچے کو مزید ڈھیل دی گئی اور اس پر پوری توجہ نہ دی گئی تو عنقریب یہ خطرناک قسم کے رجحانات اپنا لے گا۔ اپنا آپ اور والدین کی عزت برباد کر دے گا۔"

"تم کیسی ماں ہو، ماں ہو کر اولاد کی اچھی تربیت نہیں کر سکتیں؟" انہوں نے حسبِ روایت اور حسبِ عادت سارا الزام بھابی کے کندھوں پر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دے دیا۔

"اوپر سے بیٹی کو دیکھ لو۔ محترمہ نور العین ڈھنگ سے باپ کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ ہر وقت منہ چڑھا ہوا۔ کام کاج میں بے پروائی، اور لہجے میں زہر بھری کڑواہٹ۔" وہ مسلسل بول رہے تھے۔

اپنے کمرے میں بیٹھی اریشہ بھابی کی بے بسی کو محسوس کر سکتی تھی۔

"میں تو اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی ہوں مگر......" بھابی منمنائیں "اصل میں...... صرف ماں کے کہنے سے اولاد نہیں سدھرا کرتی۔ باپ کا خوف، ڈر اور لحاظ اسی وقت قائم رہتا ہے جب وہ ان کے سر پر رہے اور ہر وقت ان کے بارے میں کنسرن رکھے تاکہ انہیں احساس ہو کہ ہم جو بھی کریں گے، باپ کے آگے اس کا جواز دینا پڑے گا۔ آپ...... آپ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ بچوں کی خبر گیری اور......"

"ہاں ہاں، میں تو باہر عیاشی کرنے جاتا ہوں نا!" وہ اشتعال میں آگئے۔

"انہی کے لیے کمانے جاتا ہوں نا، کیا کچھ نہیں دے رکھا میں نے انہیں۔ اپنا مکان ہے۔ گاڑی بھی لے دی

ہے قسطوں پر۔ گھر میں ٹیپ، ٹی وی، فریج، وی سی آر، فرنیچر، کراکری سب ہی کچھ ہے۔ رہنے کو دونوں کے لیے الگ الگ کمرے ہیں۔ پڑھ لکھ بھی رہے ہیں اور کیا چاہیے انہیں؟"

"توجہ......" اریشہ نے گہری سانس لے کر دل ہی دل میں جواب سوچا تھا۔

راحت بھابی سر جھکائے سنتی رہیں۔ بھایا جی تن فن کرتے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

اریشہ نے باقاعدہ "سانجھ نگر" جوائن کرلیا تھا۔ اس خبر پر بھی بھایا جی نے بھابی کو کافی باتیں سنائی تھیں۔

"ہاں بھئی، یہ بھی تمہاری ہی تربیت ہے۔ میری بہن کو گھر بٹھا کر کھلانا تمہارے لیے اب بوجھ بن گیا تھا ناں! اسی لیے اسے ملازمت کی راہ دکھائی ہے۔"

راحت کے یہ کہنے پر کہ "آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" وہ ایک دم ان پر الٹ پڑے تھے۔ بھابی نے بڑ بڑا کر آہستگی سے جواباً کچھ کہا۔

"بیٹی سمجھا ہوتا تو اسے باہر یوں لور لور کر پھرنے کی اجازت نہ دی ہوتی۔"

"بھایا جی، بھابی کو الزام نہ دیجیے۔ میں نے اپنی خوشی سے جاب شروع کی ہے۔" وہ بھابی کی ذات پر حرف آتے نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے از خود باہر نکل آئی تھی۔

"تمہارا دماغ بھی اسی عورت نے خراب کیا ہے۔ یہ ہے ہی ایسی بد خصلت۔" وہ پیر پٹختے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"بھابی پلیز، روئیں نہیں۔" اس نے احساسِ ذلت سے سرخ پڑتی راحت العین کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

"آئی ایم سوری، آپ کو میری وجہ سے یہ سب سننا پڑا۔" اس کی آواز پر شرمندگی غالب آ گئی۔

"خصوصیت سے تمہاری وجہ سے نہیں مجھے تو ہر کام اور ہر بات پر یہی کچھ سننے کو ملتا ہے۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔" وہ زبردستی مسکرائیں۔ اریشہ کو ان کے مسکرانے سے دلی اذیت ہوئی۔

"بے قدرے ہیں جی بھر کے۔" اریشہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ورنہ آپ تو ایسی ہیں کہ جس کی جگہ دل میں اور آنکھوں میں ہوتی ہے۔ ذلت کی ٹھوکروں میں نہیں۔"

اسے افسوس ہوا۔

☆☆☆

"کدھر ہے شاہدہ؟" سیٹھ وہاب نے گھر میں داخل ہوتے ہی دریافت کیا۔

"وہ پڑوس میں گئی ہے۔" نجو بی نے پان چباتے ہوئے بتایا۔

"بڑا شوق ہے تمہیں اسے اڑوس پڑوس میں بھیجنے کا؟" وہ تلخی آمیز بیزاری سے گویا ہوئے۔

"ارے میاں بچی محلے داروں سے گھلے ملے گی نہیں تو کل کلاں کو رشتہ کیسے آئے گا؟" وہ جل کر بولیں۔

"بڑی فکر ہے تمہیں رشتے کی۔ تمہیں یہاں لا کے کس لیے رکھا ہے؟ شاہدہ کے لیے "ایسا ویسا" سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ زہریلے تیور لیے گویا تھے۔

"اب نہیں سوچوں گی تو پھر کب سوچوں گی؟" نجو بی نے ہاتھ نچایا۔

"اگر تمہیں ایسی ہی آگ لگی ہوئی ہے تو میں دو چار دن بعد نکاح خواں پکڑ کے ساتھ لے آؤں گا۔ دو بول پڑھوا کے میرے ساتھ وداع کر دینا۔" وہ اکھڑے ہوئے لب و لہجے میں گویا تھے۔

"اے میاں کیا خود کرو گے شادی!" نجو بی نے ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر جی بھر کے حیرانی ظاہر کی۔

"تو اور کس مقصد کے لیے تمہیں جھونپڑے سے اٹھا کر اس گھر میں لا کے رکھا ہے؟" وہ پھنکارے۔

لیکن نجو بی زمانہ شناس تھی اس پر اس پھنکاری کا کوئی اثر نہیں ہوا "لیکن میاں تم تو شادی شدہ ہو۔"

"زیادہ بھولی بننے کی ضرورت نہیں ہے نجو بی، یہ بات تم پہلے بھی جانتی تھیں کہ میں بیوی بچوں والا ہوں۔" وہ حلق تک بیزار اور سلگتے ہوئے نظر آئے "میں شاہدہ کو الگ رکھوں گا۔ یہیں رہے گی وہ......" پھر انہوں نے مصلحتاً لہجہ دھیما کر لیا۔

"اے میاں، خدا لگتی کہوں گی۔ شادی کرنی ہے تو پھر بیاہ کر اسی گھر لے کے جاؤ جہاں خود رہتے ہو۔ میری بچی

دوسری بیوی کہلانا گوارا کرے گی۔ اگر تم اسے اپنے گھر کی رانی بنا کے رکھو۔" وہ چالاکی سے بولیں۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بادلِ ناخواستہ جان چھڑانے کو مان گئے "اگر شاہدہ چاہے گی تو میں اسے اپنی بیوی کے ساتھ رکھوں گا۔ اب یہ بتاؤ کہ قاضی کو کب بلوایا جائے؟"

"پہلے ہمیں اپنا گھر تو دکھاؤ میاں۔ تاکہ پھر ہم کسی فیصلے پر پہنچ سکیں۔" وہ بضد رہیں۔

"ٹھیک ہے، پرسوں شام کو آجانا اس ایڈریس پر۔" انہوں نے کارڈ جیب سے نکالا "دو گلیاں چھوڑ کر چار سو سات مکان نمبر ہے۔" انہوں نے جھلا کر بتایا۔

"ہم پہنچ جائیں گے جناب!" بڑی دیر سے خاموش چھمن میاں نے گویا انٹری دی۔ وہاب صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوگئے۔

"تم ہرگز نہیں جاؤ گے۔" وہاب صاحب نے اسے دیکھ کر سختی سے کہا "تمہاری تو شکل سے ہی فقیر پنا ٹپکتا ہے...... اور ہاں۔" وہ نجو بی کی طرف مڑے "تمہیں یہی بتانا ہوگا کہ شاہدہ میرے ہاں سیکریٹری کی جاب کرتی ہے۔"

"جو حکم سرکار۔" نجو بی نے مکاری سے سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

"امی، یہ کون "محترمائیں" تھیں؟" نورالعین نے ان کے جانے کے بعد بے حد ناگواری سے دریافت کیا تھا۔

"تمہارے بابا جی کے آفس میں کام کرتی ہے۔ ساتھ میں اس کی امی اور بہن تھیں۔" راحت العین نے آہستگی سے جواب دیا۔ وہ ڈرائنگ روم کی ٹیبل پر پڑے برتن اور کھانے پینے کی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔

"ہمارے گھر کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے عن قریب مالکانہ حقوق حاصل کرنے والی ہوں۔" نورالعین نے منہ بنایا۔

"اچھا اس قصے کو جانے دو، نور میری بات سنو۔ تمہارے بابا جی تمہاری بہت شکایت کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے تم ان سے بس ہی ہیلو کرتی ہو۔ ٹھیک سے بات نہیں کرتیں۔ سلام بھی نہیں کرتی ہو۔ دیکھو چندا...... یہ اچھی بات نہیں ہے۔ وہ تمہارے باپ ہیں۔"

"یہ میں تو جانتی ہوں۔ غالباً" وہ "نہیں جانتے۔" وہ استہزائیہ بولی "انہیں جا کر بتایئے کہ اس گھر کے کسی کونے میں ان کی ایک بیٹی بھی رہتی ہے۔" وہ بے حد تلخی سے گویا تھی۔

"نورا" راحت نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا "یہ صلہ دیا ہے میری تربیت کا۔" وہ شاکی اور ملول نظر آئیں۔

"تربیت بھی وہیں اثر کرتی ہے امی جہاں خون میں اچھائی اور نرمی شامل ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہی ہوتا ہے، جو میرا اور طاہر کا حال ہے۔"

"طاہر کو تو خدا جانے روز بہ روز کیا ہوتا جا رہا ہے۔ نہ ڈھنگ سے بات کرتا ہے نہ پاس بیٹھتا ہے اور نہ سننے کی زحمت کرتا ہے۔"

"وہ موصوف "گینگسٹر" بننے کی تیاریوں میں ہیں۔" نورالعین کا لہجہ بے تاثر رہا۔

"اللہ نہ کرے!" اریشہ نے پیچھے سے دہل کر کہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اندر آئی تھی "کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔"

"ہاں تو اور کیا ہوگا یہاں پھپھو، گھر کی دیواریں ٹوٹ جائیں تو چھتیں زیادہ دیر تک سلامت نہیں رہا کرتیں۔ باپ بیٹے کے سر پر اور پشت پر ہاتھ نہیں رکھے گا تو بیٹا تو خود بخود آوارہ ہوگا۔" وہ بے حسی سے گویا ہوئی۔

اریشہ سر تھام کر رہ گئی۔

"اچھا یہ برتن اٹھاؤ۔" راحت العین نے اسے ٹالا

"مجھے تو اس کے تیور بھی ٹھیک نہیں لگ رہے اریشہ۔" اس کے جانے کے بعد راحت پریشانی اور مایوسی کے ملے جلے انداز میں مخاطب ہوئیں۔

"جب سے اس نے فرسٹ ایئر میں کالج میں ایڈمیشن لیا ہے اس کے انداز بدلے بدلے لگ رہے ہیں۔ ایک عجیب سی سرکشی آتی جا رہی ہے اس میں۔ کالج کے ماہانہ ٹیسٹ میں فیل ہوگئی ہے۔ پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دے رہی۔ کل میں نے صبح کی نماز کے لیے اٹھایا تو مجھ سے بری طرح الجھ پڑی۔ بولی......

"رہنے دیں اپنی نماز قرآن، کیا ملتا ہے ان سے۔ میں نے ہول کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور پیار سے کہا۔ ان سے سکون ملتا ہے بیٹی خود قرآن بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ بے شک دلوں کا سکون ذکر الٰہی سے ہی ملتا ہے۔ کہنے لگی بھٹکے ہوئے دلوں کو کہیں بھی چین سکون نہیں ملتا۔ میرا نماز سے جی اچاٹ ہوگیا ہے۔ پڑھنے کو دل نہیں کرتا۔ میں تو کلیجا پکڑ کر رہ گئی اریشہ، یہ میرے بچے بڑے ہو کر کن سمتوں میں بھاگنے لگے ہیں۔" وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

"حوصلہ رکھیں بھابی، جب گھوڑا نیا نیا سواری کا بوجھ اٹھانا سیکھتا ہے تو ابتدا میں بہت اڑی کرتا ہے۔ بڑا غرور ہوتا ہے اسے اپنی جوانی پر لیکن تابکے...... بالآخر مالک اسے سدھا کر زیر کر ہی لیتا ہے۔ نئی نئی جوان ہونے والی نوجوان نسل کا بھی یہی حال ہوتا ہے اس لیے وہ شروع میں سرکشی اور خودسری پر اتر آتی ہے مگر آہستہ آہستہ جب زندگی کے بوجھ لدنے لگتے ہیں تو خود بخود مزاج کا اتاولا پن جاتا رہتا ہے۔" اریشہ نے سلیقے سے سمجھایا۔

"کچھ دیر جاتی ہے جب بارِ حیات سے کندھے جھکنے لگیں گے۔ زمانے کی اصلیت اور بھیانک حقائق سے واسطہ پڑے گا تو طبیعت میں از خود ٹھہراؤ اور دھیما پن پیدا ہوجائے گا۔" وہ مزید گویا ہوئی۔

"اچھا۔" راحت بھابی غالباً اس کا دل رکھنے کو اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے لگیں "تم سناؤ، تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے۔ ادارے میں دل لگ گیا؟"

"ارے بھابی، پتا ہی نہیں چلتا کہ جاب کر رہے ہیں۔ وہاں بندہ خود کو فیملی ممبر کی طرح محسوس کرتا ہے۔ سارا کریڈٹ عثمانی صاحب کے بااصول اور منظم انداز کو جاتا ہے۔ وہ ہر ورکر کو یکساں اہمیت اور مواقع فراہم کرتے ہیں۔" وہ اپنی جاب کے بارے میں بتانے لگی۔ راحت العین نے بڑی چاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"بس اب تو مجھے ایک ہی آرزو ہے۔ جلد از جلد تمہیں کسی اچھے گھرانے میں بیاہ دوں اور تمہیں اپنے گھر میں ہنستے مسکراتے اور مطمئن زندگی گزارتے دیکھوں۔" وہ جھینپ کر رہ گئی۔

☆☆☆

"اُدھر نہیں میڈم اِدھر۔" وہ ادارے سے چھٹی ہوتے ہی گیٹ پر آئی اور کچھ فاصلے پر کھڑی ادارے کی وین کی طرف قدم بڑھانے کو تھی جب عاصم اچانک اس کے سامنے آگیا۔

"تم...... اور یہاں، اس حلیے میں!" اریشہ نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے سرتاپا اسے دیکھا۔

"میں آج چھٹی پر ہوں۔ واک کے لیے نکلا تھا۔ اسی جھونک میں ادھر چلا آیا۔ سوچا ہائے ہیلو کر لی جائے آپ سے۔" وہ نگاہِ پُرشوق لیے گویا ہوا۔

"گویا آپ محض "اتفاقاً" یہاں چلے آئے ہیں۔" اریشہ نے اس کے دانستہ جھوٹ کو پکڑ لیا۔ وہ ہنس دیا۔

"جب جانتی ہو تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔" اس نے شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ ایک طرح کا اعتراف تھی۔

شکن آلود ہلکے نیلے شلوار قمیص اور گھریلو سی چپل میں اس رف سے حلیے میں بھی وہ بہت شان دار اور متاثر کن شخصیت دکھائی دے رہا تھا۔

"آیئے، شرافت سے گاڑی میں تشریف رکھیے۔" اس نے دور کھڑی اپنی ہنڈا سوک کی طرف اشارہ کیا۔

"گویا گاڑی بھی "واک" کرتے ہوئے یہاں تک چلی آئی ہے، ہے ناں!"

"جی ہاں، جی ہاں۔" وہ کان کھجا کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

"دیکھیں مسٹر اے سی، یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہیں۔ آپ اپنا اور اپنی گاڑی کا پہلی فرصت میں علاج کرایئے۔"

"بہت بہتر جنابِ عالیہ، کیا خیال ہے اب تشریف رکھی جائے؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ وہ ناچار اس کی کار میں بیٹھ گئی۔

"عاصم میں سیریس ہوں۔"

"اور میں تو صد فیصد سیریس ہوں میری جان۔" وہ لہک کر وارفتگی سے گویا ہوا۔

"اُفوہ!" وہ خجل ہوگئی "دیکھو، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ تمہارا مجھ سے یوں دور دور رہنا۔ میرے گھر میں قدم رنجہ نہ فرمانا اور مجھ سے نظریں نہ ملانا۔" وہ برجستہ بولا۔

''تم سنجیدہ ہونے کا کیا لوگے؟'' وہ زچ ہوگئی۔

''بتادوں!'' وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ انداز معنی خیز اور گستاخانہ شوخی لیے ہوئے تھا۔ وہ خاک بھی نہ سمجھ سکی۔

''ہاں، بتا ہی دو۔'' وہ سادگی سے بولی۔

عاصم نے ایک لمحے کو اس کے گل رنگ چہرے کے ملائم نقوش کو جوشیلی نظروں سے دیکھا پھر جانے کیوں ہنس کر نظر چُرا گیا ''چلو چھوڑو، بتادیا تو برا مان جاؤ گی۔''

''ایسی کیا بات ہے جس پر میں برا مان جاؤں گی؟'' وہ حیران ہوئی۔

''شادی کے بعد بتاؤں گا۔'' اس کے معنی خیز لہجے پر وہ کٹ کر رہ گئی۔ اس کا ننھا سا دل سینے میں دھڑ دھڑانے لگا۔ پلکیں جھکی تو گویا گالوں پر ہی بچھ گئیں۔ اس کے گھمبیر لہجے کا شوخ طلسم اس کے حواس ڈھیر کر گیا تھا۔

''تیز چلاؤ، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ گڑبڑا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''پہلے میرے ساتھ چلوگی، دادی اماں اور عاطف بڑی شدتوں سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''عاصم یہ اچھی بات نہیں ہے...... '' وہ بوکھلانے لگی۔

''میں بھی جانتا ہوں اریشہ کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' اس نے رسانیت سے بات کاٹی ''لیکن یقین کرو۔ صرف آخری بار ہے۔ عن قریب دادی اماں تمہارے بھایا جی اور بھابی سے مل کر تمہیں میرے لیے مانگنے آرہی ہیں۔'' وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اریشہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

دادی اماں حسب معمول مہربانی سے پیش آئیں۔ عاطف کا انداز وہی شوخی اور بے نیازی لیے ہوئے تھا۔

''اور سنایئے، آپ نے کون سے ''وڈ'' کی فلم دیکھی اور کیا تبصرہ سوچ کے رکھا ہے؟'' اریشہ نے بڑے اہتمام سے اسے اس کے پسندیدہ موضوع پر بولنے پر اکسایا تھا۔

''آج کل میں فلم دیکھنے نہیں ''بنانے'' پر غور کر رہا ہوں۔'' عاطف نے نہایت سنجیدگی سے ٹھوڑی کے نیچے مٹھی بنا کے رکھی۔ اریشہ کو اس کے انداز پر ہنسی آنے لگی۔

''کس موضوع پر؟'' اس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''گداگری کے موضوع پر۔'' وہ متانت سے گویا ہوا۔

''اور گداگر...... کون سی فیملی ہوگی۔ ہیروکی یا ہیروئن کے ماں باپ؟'' اریشہ روایتی اسٹوری ذہن میں لاتے ہوئے یونہی وقت گزاری کو اس موضوع میں دلچسپی لینے لگی۔

''قطعی نہیں۔ اگر آپ سوچ رہی ہیں کہ میں کوئی روایتی امیری غریبی والی کہانی تخلیق کروں گا جس میں بھکاری فیملی نہایت مظلوم اور بے چاری بنی ہوتی ہے تو آپ سراسر غلطی پر ہیں۔ میری فلم کی کہانی کا مقصد ان بھکاریوں کے طرز عمل اور طرز زندگی کی نشان دہی کرنا ہے جو پیشہ ور گداگر ہیں اور بھیک مانگ کر کمائی کرتے ہیں۔ وہ اسے ایک فن، ایک صلاحیت سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک گویا وہ بھی ''کام دھندا'' کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں۔ وہ ڈھٹائی سے خود کو محنت مزدوری کرنے والے طبقے میں شمار کرتے ہیں اور ایسے بظاہر ''بھکاری'' بباطن لمبے چوڑے بینک بیلنس کے مالک ہوتے ہیں۔ جو فقیرانہ چولے میں عوام الناس کو لوٹتے ہیں۔ انہیں دھوکا دیتے ہیں اور پھر گھر والوں کے آگے سوٹڈ بوٹڈ ہو کر پھرا کرتے ہیں۔ گویا دن بھر آفس ورک کر کے تھکے ہارے گھر کو لوٹے ہیں۔''

''اب یہ بھی بتادو کہ سینٹرل آئیڈیا کہاں سے سُوجھا ہے۔'' عاصم نے دخل اندازی کی۔

''چلیے، آپ ہی کریڈٹ لے لیجیے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر گویا احسان دھرا ''ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال کافی عرصے سے میرے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔''

''جی ہاں، بجا فرمایا۔'' عاصم نے طنز کیا پھر وہ اریشہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''موصوف نے کچھ دن پہلے میرے اسٹڈی روم میں پیشہ ور گداگروں کے بارے میں ایس پی صاحب کی مرتب کی گئی رپورٹ پڑھی تھی۔ اس دن سے ان پر فلم میکنگ کا بھوت سوار ہوا ہے۔''

''چلیے یونہی سمجھ لیجیے لیکن بھائی کتنے دکھ کی بات ہے۔ ہماری آبادی کا ایک بڑا حصہ پیشہ ور بھکاریوں پر مشتمل ہے۔ باقاعدہ بھیک مانگنے کے علاقے الاٹ کیے

جاتے ہیں ان میں بھی ایک ''دادا'' ہوتا ہے جو رشوت یا عرفِ عام میں بھتا لے کر زیادہ کمائی والا علاقہ تفویض کرتا ہے۔ ایک کی جگہ پر دوسرا فقیر نہیں کھڑا ہو سکتا۔ چھابڑی فروشوں کی طرح ان کے بھی ٹھکانے ہوتے ہیں۔ جنہیں تقسیم اور تبدیل کی جاتی ہیں پیسے کے زور پر۔ رپورٹ میں ایسے گروہ کی نشان دہی کی گئی ہے جو شام کو شریفانہ لباس میں عزت دار لوگوں کے بیچ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور دن کو اپنے شہر یا ایریے سے دُور جا کر اپنے مخصوص اڈے پر بھیک مانگ کر پیسہ اکٹھا کرتے ہیں۔ کچھ فقیر تو سچ مچ لکھ پتی ہیں اور ہم جیسے لوگوں سے زیادہ کماتے ہیں۔''

''اور یہ ایک طرح سے حرام کمائی ہے۔'' عاصم نے افسوس سے کہا۔

''ظاہر ہے، جو مال جھوٹ فریب سے عوام الناس کو دھوکا دے کے بغیر محنت کے جمع کیا جائے وہ حرام ہی کہلائے گا۔ ضرورتاً بھیک مانگنا بھی کوئی اچھا فعل بہرحال نہیں ہے، بخاری شریف میں ہے کہ انسان کا جنگل سے لکڑیوں کا گٹھا کمر پر اٹھا کر لانا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی فرمایا ہے کہ جو شخص سوال کرنے سے باز رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے غنی کر دیتا ہے۔''

''میں اپنی فلم میں ان تمام پہلوؤں کو ڈسکس کر کے عوام الناس کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام نے بھیک مانگنے کو قطعی پسندیدہ فعل قرار نہیں دیا اور خاص طور پر بلا عذر محض پیسے کمانے اور لالچ اور ہوس کے لیے مانگنا تو سیدھا سیدھا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جو شخص لوگوں سے ہمیشہ مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہو گی اور اس کے برعکس ''محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے'' یہ قرآن کہتا ہے۔'' عاطف نے اظہارِ خیال کیا۔

اریشہ نے محسوس کیا کہ دونوں بھائیوں کی دینی معلومات قابلِ رشک تھیں۔ غالباً یہ دادی اماں کی صحبت اور تربیت کا کمال تھا۔

''میری پوری کوشش ہے کہ میں ایسے عناصر کا کھوج لگاؤں اور ان کے چہرے بے نقاب کروں جنہوں نے ہمارے معاشرے کی مجموعی تصویر بگاڑ کے رکھ دی ہے۔'' عاصم سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

''مجھے اجازت دو، خاصی دیر ہو گئی ہے۔'' اریشہ جانے کو تیار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''مائی گاڈ! امی وہ جو اس دن دو محترمائیں آئی تھیں ان میں سے ایک ''محترمہ'' کو میں نے اپنے کالج کے آگے بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ وہ جو لڑکی کی اماں بنی ہوئی تھی۔ وہ فقیروں والا حلیہ بنائے روایتی فقیرانہ صدائیں لگا رہی تھی مجھے دیکھ کر رفو چکر ہو گئی۔'' کالج سے واپس آتے ہی نور العین نے پھولے سانسوں سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

''ہائیں!'' راحت العین کو یقین نہ آیا ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی بیٹی تو تمہارے بھایا جی کے آفس میں جاب کرتی ہے۔''

''کیا پتا وہ شوقیہ بھکارن ہو۔'' اریشہ کے دماغ میں کھد بد ہونے لگی۔ کچھ دن پہلے کی عاصم اور عاطف کی گفتگو کے الفاظ ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔

''شوقیہ بھکارن؟'' نور العین نے استفہامیہ کہا۔

''ہاں بھئی، جنہیں مفت میں پیسہ کمانے کی چاٹ پڑ جائے وہ لالچ میں بڑی آسانی سے اپنی عزتِ نفس کی قربانی دے دیتے ہیں۔''

''عجیب دنیا ہے یہ۔'' راحت العین نے رنج سے کہا ''حالانکہ اسلام کہتا ہے کہ قیامت کے دن جب حساب کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہو گی تو آدمی کے پاؤں اپنی جگہ سے سرک نہ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کا سوال نہ کر لیا جائے گا۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہو گا کہ مال و دولت کہاں سے، کن طریقوں سے اور کن راستوں سے حاصل کیا گیا۔''

''خوفِ آخرت رہا ہی کہاں ہے، اگر ہو تو لوگ ایسے کام ہی کیوں کریں۔'' اریشہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

''شام کو کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ ایک بزرگ خاتون نے کل فون کر کے بتایا تھا۔ انہوں نے تمہیں کہیں دیکھ رکھا ہے۔ اپنے اے سی پوتے کے لیے رشتے کی خواستگار ہیں۔

تم ذرا اپنا حلیہ درست کر لینا۔'' راحت العین اچانک یاد آ جانے پر اریشہ کو تاکید کرنے لگیں۔ ایک خوب صورت، آسودہ اور فخریہ مسکراہٹ اریشہ کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ اسے عاصم کے محتاط انداز پر بے ساختہ پیار آیا۔

اگر وہ دادی اماں کو اپنی پسند کا حوالہ دے کر بات کرنے بھیجتا تو یقیناً بھایا جی کا ردِعمل سخت ہوتا اور پھر الزام اریشہ پر آتا کہ یہ باہر عشق و عاشقی کرتی پھرتی ہے۔ یقیناً یہ ایک مہذب اور خیر خواہانہ طریقہ تھا رشتہ مانگنے کا۔

شام کو دادی اماں اور عاطف کے ساتھ ایک دادی ہی کی عمر کی خاتون بھی تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ دادی کی رشتے دار اور بہت گہری سہیلی تھیں۔ اندرونِ شہر جسے قدیم پنڈی بھی کہا جاتا تھا وہیں کہیں تنگ سی گلیوں میں رہتی تھیں۔ اردو بازار اور پرانے قلعے کے آس پاس۔ دادی اماں اکثر اپنی سہیلی سے ملنے جاتی رہتی تھیں۔ آج بھی بہ نفسِ نفیس عاطف کے ساتھ انہیں لینے گئی تھیں تاکہ وہ بھی ان کے پوتے کی خوشی میں شریک اور شامل رہیں۔

دادی اماں نے سادگی سے اپنے خاندان اور عاصم کی شخصیت اور جاب کے بارے میں بتایا اور پھر عرضِ مدعا بیان کر دیا۔ عاطف صاحب بڑے شریف بنے بیٹھے تھے۔ راحت العین کو ان سے مل کر اور لڑکے کے بارے میں جان کر دلی خوشی ہوئی۔

''اماں جی، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن حتمی فیصلہ اریشہ کے بھائی ہی کریں گے۔ وہ آفس سے بس آتے ہی ہوں گے۔ آپ ان سے براہِ راست بات کر لیجیے گا۔'' وہ انکساری و عاجزی سے گویا ہوئیں۔

''ہم انتظار کیے لیتے ہیں بیٹی!''

اسی اثنا میں بھایا جی آ گئے۔ راحت العین نے انہیں ان کی آمد کی غرض و غایت بتائی تو وہ فوراً خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹھ گئے ''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، خیر سے صاحب زادے کیا کرتے ہیں؟'' وہ دلچسپی سے پوچھنے لگے۔

دادی اماں کی نظریں الجھن کے عالم میں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے کچھ کھوئی گئی تھیں۔ جواب تو انہوں نے دے دیا مگر انداز عجب گم صم سا تھا۔

''آپ کا کس چیز کا آفس ہے؟'' بالآخر انہوں نے سوال کیا۔

''میری گارمنٹ فیکٹری ہے۔ ادھر پنڈی میں، وہاب گارمنٹس کا نام یقیناً آپ نے سن رکھا ہو گا۔'' وہ روانی سے گویا تھے۔

''شاید......'' دادی اماں کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔

کھڑکی کے پردے سے چپکی اریشہ نے محسوس کیا کہ دادی اماں کا لہجہ اس طرح پُر جوش اور خوش باش نہیں رہا تھا جیسا راحت بھابی سے بات کرتے ہوئے تھا۔ شاید انہیں بھایا جی کی طبیعت کی سختی اور اکھڑ پنے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اریشہ نے خود ہی اندازہ لگایا۔ بھئی بزرگوں کا تجربہ بھی تو بہت ہوتا ہے۔ خود بخود بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

''اجازت دو بیٹی، ہم چلتے ہیں۔'' دادی اماں جلد ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ کچھ بے چین اور مضطرب دکھائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

''عاطف، ذرا ''وہاب گارمنٹس'' کی طرف گاڑی موڑ دو۔'' واپسی پر اچانک دادی اماں نے فرمائش کی تھی۔ عاطف پہلے چونکا پھر مسکرا دیا۔

''گویا آپ بھی تحقیق و تفتیش کے بعد رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔ آخر ہیں ناں اے سی کی دادی اماں۔ چلیے آپ چل کر تسلی کر لیجیے۔'' عاطف نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔

عاطف نے وہاب گارمنٹس کے آگے گاڑی روکی۔ یہ فیکٹری آبادی سے کافی ہٹ کر تھی۔ دادی اماں بہ نفسِ نفیس اس کے ساتھ اندر آئیں۔

''اس فیکٹری کا مالک کون ہے؟'' دادی اماں کے اشارے پر عاطف نے سوال کیا۔

''سیٹھ وہاب احمد۔''

''کیا وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود ہیں؟'' دادی اماں کا سوال عاطف کے سر پر سے گزر گیا۔

''جی ہاں۔'' گارڈ نے جواب دیا ''آج مال کی کوئٹہ میں ڈلیوری ہے۔ سیٹھ صاحب ابھی تک ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں؟'' دادی اماں نے

بدستور سوالنامہ جاری رکھا۔ اب بات کچھ کچھ عاطف کی سمجھ میں بھی آنے لگی تھی۔ اسے دادی اماں کی زیرک اور زود فہم طبیعت پر خاصا تعجب تھا۔

"مگر کس سلسلے میں؟"

"ایک بہت ضروری کام ہے۔ انہیں کہوا ے، بی عاصم بخاری کی فیملی ان سے پانچ منٹ کی ملاقات چاہتی ہے۔" دادی اماں نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رکھا۔

تھوڑی دیر بعد چپراسی واپس آیا اور انہیں اپنے ہمراہ لے گیا۔ جونہی سیٹھ وہاب احمد کو دیکھا دونوں کو جھٹکا لگا۔ عاطف مناسب سا بہانہ تراش کر سیٹھ صاحب کو مطمئن کر کے دادی اماں کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ باقی سفر کے دوران دونوں بہت خاموش اور ایک دوسرے سے نظر چرائے رہے۔

☆☆☆

اریشہ کے آنسو... رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ نورالعین غصے سے بھری اسے چپ کرا رہی تھی جبکہ راحت اس سے کچھ فاصلے پر تصویرِ غم بنی بیٹھی تھیں۔

"میں تو شرمندگی سے غرق ہی ہو گئی جب عاصم نے فون کر کے بتایا کہ تمہارے بھائی صاحب نے بوگس ایڈریس بتایا تھا۔ وہ تو کسی اور سیٹھ وہاب احمد کی فیکٹری ہے۔ بھایا جی ہم سب کو بے وقوف بناتے رہے۔ ان کا خیال ہوگا یہ سادہ لوح گھریلو عورتیں ان کو کون سا پتا چلے گا۔ جو مرضی بتا دو۔ اسی پر یقین کر لیں گی۔"

"بھایا جی نے ایسا کیوں کیا، کیا سوچتی ہوں گی وہ دادی اماں۔ مائی گاڈ!" نورالعین غم و غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

"میں خود پوچھوں گی ان سے کہ انہوں نے اتنا عرصہ ہمیں دھوکے میں کیوں رکھا؟"

"تم چپ کر کے بیٹھی رہو۔" راحت نے سختی سے بیٹی کو جھڑک کر چپ کرا دیا "میں خود بات کروں گی۔"

جب انہوں نے بات کی تو وہاب صاحب نے بغیر چونکے نہایت بے پروائی سے جواب دیا۔

"ہاں تو گارمنٹس فیکٹری میں چھ ماہ پہلے بیچ چکا ہوں۔ مسلسل نقصان ہو رہا تھا۔ اب اسی رقم سے میں ایکسپورٹ امپورٹ کے بزنس میں حصے دار بن گیا ہوں۔"

"آپ نے ہمیں بتایا تو ہوتا۔" راحت العین نے شکر کی سانس لی مگر ساتھ ہی شکوہ بھی کیا۔

"اب ہر بات عورتوں کو بتانے کی نہیں ہوتی۔"

"تو پھر ان رشتہ لانے والی اماں کو آپ نے وہاب گارمنٹس کا حوالہ کیوں دیا؟ انہوں نے جا کر تحقیق کی تو بات جھوٹی نکلی۔"

"وہ بھی کسی شرلاک ہومز کی دادی ہیں گویا......" وہ ناگواری سے بولے "میں نے تو بس حوالے کے لیے کہا تھا یہ تھوڑی پتا تھا کہ وہ سچ مچ وہاں پہنچ جائیں گی۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنا ایکسپورٹ امپورٹ کا دفتر کھولنے کے بعد اس کے بارے میں سب کو بتاؤں گا۔" وہ اپنا کوٹ الماری میں لٹکانے لگے۔

اریشہ کو پتا چلا تو اس نے بھی سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ عاصم کی نظروں میں تو سرخرو ہو گئی تھی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔

☆☆☆

"نور یار، اب کتنی دکانیں گھماؤ گی۔ پورا بازار گھوم لیا ہے اور اب پرانے قلعے میں لور لور پھر رہی ہو۔ آخر وہ کس قسم کا سوٹ تھا جو مل کے نہیں دے رہا۔" اریشہ کا مارے کوفت اور تھکن کے بُرا حال تھا۔ موصوفہ نے اپنی دوست کی شادی میں کسی کو ایک سوٹ پہنے دیکھا تھا۔ تب سے وہ اریشہ کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ پرانا قلعہ چلے۔ دونوں کا اس علاقے میں آنے کا پہلا پہلا تجربہ تھا۔

"بس پھپھو! چند دکانیں اور چھان لیں۔ شاید مل ہی جائے۔" نورالعین نے ابھی بھی ہمت نہیں ہاری۔

"اللہ کے نام پہ دیتا جا بابا، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ دو روز سے بھوکا ہوں۔ میری بیوی کو ٹی بی ہے۔ علاج کے لیے پیسہ نہیں ہے۔ دے جا سخی راہِ خدا......"

رش والی جگہ پر جو ہاڑے اور پرانے قلعے کے بین بین تھی اور جس کے ساتھ ایک مصروف ترین سڑک لنک تھی۔ انہوں نے مانوس آواز پر پلٹ کر دیکھا اور جیسے دونوں ہی پتھر کی ہو گئیں۔

نہایت غلیظ اور بوسیدہ پھٹے پرانے کپڑوں میں چہرے پہ کالک ملے گلے میں منکوں کے ہار اور ہاتھ میں کشکول لیے سر پر لمبی جٹاؤں والی وگ پہنے ہانک لگاتے اس فقیر کو پہچاننا ایسا دشوار تو نہ تھا کہ بہر حال اپنا ''خون'' تھا۔

''بھایا جی......!'' اریشہ کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور اپنی جھونک میں آوازے لگاتے وہاب صاحب نے جو نہی سر اٹھا کر بہن اور بیٹی کو کچھ فاصلے پر بت بنے دیکھا وہ خود بھی تیسرا بت بن گئے۔ تینوں کو سانپ سونگھ گیا۔ تینوں ہی ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہے۔

''مائی گاڈ۔'' نورالعین کی آنکھوں میں لہو اترنے لگا تھا۔ وہاب صاحب کی آواز بند ہوگئی اور نورالعین اور اریشہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔

☆☆☆

''یا خدا...... کوئی آسمان ٹوٹ پڑتا تو ایسا غضب نہ ہوتا جتنا اپنے باپ کو بھکاری کے روپ میں چوک پہ بیٹھ کے جھوٹ کی بھیک مانگتے دیکھ کر ہوا۔ اپنے ہونے پر شرم آئی مجھے۔ بھایا جی...... کیا آپ سچ مچ ہمارے باپ ہیں! اریشہ پھوپھو کے بھائی ہیں! امی کے شوہر ہیں! انہیں کچھ نہیں لگتے آپ ہمارے۔'' نورالعین دیوانگی کے عالم میں آنسو بہاتے ہوئے چلائی تھی۔

وہاب صاحب گھر آچکے تھے اور گھر والوں کی عدالت میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کا رنگ زرد پڑچکا تھا اور پلکوں پر اتنا بوجھ تھا کہ وہ اٹھنے سے انکاری ہوگئی تھیں۔ ان کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ گویا وہ رعشے کے مریض ہوں۔

''آپ نے...... آپ نے بھایا جی ہم سے جھوٹ بولا، دنیا سے جھوٹ بولا، خدا سے جھوٹ بولا۔ خدا اور رسول کی تعلیمات سے جھوٹ بولا......'' شدتِ کرب سے اریشہ کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

نورالعین پاگلوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ یہ صدمہ اس کی برداشت کے لیے بہت بڑا امتحان بن کر سامنے آیا تھا اور اس کی چیخ وپکار اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ ضبط کے اس امتحان میں ناکام رہی تھی۔

''مگر نہیں...... ہم آپ ہی کی اولاد ہیں۔ یہ گھر آپ ہی کا ہو سکتا ہے۔ حرام کمائی سے بنایا جانے والا گھر اور اس کمائی پر پلنے والے بچے...... کسی میں سکون اور برکت نہیں ہوتی۔ جب ہمارے خون میں جھوٹ دھوکا اور فراڈ شامل کردیا گیا تو پھر ہم اس سے مختلف کیونکر نکلتے، دیکھ لیجیے کم از کم میں نے اور طاہر نے پوری طرح ''حقِ وراثت'' نبھایا ہے۔ طاہر آوارہ ہوچکا ہے اور میں...... میں نہ دین کی رہی ہوں نہ دنیا کی۔ نہ ماں باپ کی عزت اور محبت کے واسطے مجھے سرکشی اور نافرمانی کے راستے سے روکتے ہیں نہ سزائے آخرت کے خوف سے دل لرزتا ہے۔ ہم کہیں کے نہیں رہے۔ یہ گھر میری ماں کے بے بس اور مظلوم آنسوؤں سے ڈوبا رہا ہے ہمیشہ۔ اس گھر کی جڑوں میں بیٹھی بے سکونی کا واحد سبب وہ رزق ہے جو آپ نے ناجائز طریقے سے ہمیں فراہم کیا۔''

نورالعین بدستور اشتعال کے عالم میں چیخ رہی تھی۔

''میرا باپ اور پیشہ ور بھکاری! اچھی مجھے سوچ کر ہی شرم آرہی ہے۔ مجھے خود سے گھن آرہی ہے۔ مجھے آئینے سے خوف آرہا ہے۔'' وہ دیوانہ وار اپنا سر دیوار سے ٹکرانے لگی۔

''نور...... نور...... میری جان......'' اریشہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ راحت العین نے برستے آنسوؤں سے بیٹی کو اپنے سینے سے لگالیا۔

''بس کرو، بس کرو بیٹی۔'' وہاب صاحب کا پورا چہرہ ندامت کے پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔ ان کا لہجہ نہایت آہستہ تھا۔ غالباً پہلی بار انہوں نے صدقِ دل سے اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''سوچیں ذرا، کبھی ہمارے کسی جاننے والے کی نظر آپ پر پڑجاتی تو کیا ہوتا۔ یا اب ایسا ہوجائے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے لیکن شاید آپ نے جاننے والوں کی نظروں سے بچنے کے لیے ہی اتنی دور کا ''علاقہ'' چنا تھا۔ تاکہ اس قدر رش میں اور اسلام آباد سے بہت ہٹ کر گنجان آباد جگہ میں نہ کوئی واقف کار یا گھر والے آئیں گے نہ بھانڈا پھوٹے گا۔'' نورالعین کے لہجے

میں انتہا کی تلخی تھی۔

وہاب صاحب کی خاموشی اور جھکا سر نورالعین کے اندازے کی تائید کر رہے تھے "میں چھوڑ دوں گا بیٹی، بہت جلد یہ لائن چھوڑ دوں گا۔" ان کا لہجہ کھوکھلا اور خالی خالی سا تھا۔

"ہونہہ...... اب! اب بھابا جی۔" اس کے لہجے میں طنز اور دکھ کا ملا جلا تاثر تھا "برسوں کی لگی یہ چاٹ اتنی آسانی سے کیسے جائے گی اور پھر اگر بھیک مانگنا چھوڑ دیں گے تو کمائیں گے کہاں سے۔ غالباً آپ کو یہی ایک "پیشہ" تو آتا ہے۔ یہی ایک "ہنر" تو سیکھا ہے آپ نے۔"

وہاب صاحب ندامت اور احساس گناہ سے بوجھل قدم گھسیٹتے ہوئے بمشکل تمام اٹھ کر اپنے کمرے میں آئے ...... آتے ہی نڈھال ہو کر بستر پر گر گئے۔

"شاید آج کا سورج میرے لیے ذلتوں کا تحفہ لے کر طلوع ہوا تھا۔" وہ سوچنے لگے۔

آج صبح ہی تو وہ حسب سابق تیار ہو کر شاہدہ سے ملنے نجو بی کے پاس آئے تھے۔ آج نجو بی کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

"اب بتاؤ، کب نکاح کے لیے بندے لاؤں۔ اب تو تسلی ہو گئی ہو گی تمہاری۔ میرا گھر بھی دیکھ لیا ہے۔"

"مگر اصل حقیقت تو کل شام باڑے اور پرانے قلعے میں شادو کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے سامنے آئی ہے وہاب میاں! بڑے "دھندے" والی جگہ پہ فیکٹری لگائی ہے تم نے۔" نجو بی نے بڑے مزے سے گھٹنے کے نیچے تکیہ دبایا۔

ایک دم وہاب صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ وہ گھبرا گئے "کک...... کیا مطلب......؟"

"مطلب تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو وہاب میاں!" نجو بی نے ایک دم سخت تاثرات آنکھوں میں لے کر انہیں گھورا "ہماری ہی برادری سے ہو اور ہم ہی سے ہاتھ کر گئے۔ واہ میاں واہ...... تم سے تو ہم ہی بھلے کہ صاف سامنے آ گئے۔ تم تو آگے سے ہو کر ملے ہو۔ ذات کے فقیر اور نام کے سیٹھ۔ فقیروں میں ہی بٹی بیاہنا ہوتی تو میری برادری میں بہتیرے رشتے تھے۔ جاؤ میاں اپنی راہ لو۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"اے بڑھیا، منہ سنبھال کے...... ذات کا فقیر نہیں ہوں میں۔ میرے باپ دادا شریف اور سرکاری ملازم رہے ہیں۔" وہ یک لخت غرائے تھے۔

"تو گویا تم نے ہی ان کے نام کو بٹہ لگایا ہے۔" وہ زہریلے انداز میں گویا ہوئی۔

"میٹرک کے بعد آگے نہیں پڑھا میں نے، باپ نے ایک اسکول میں کینٹین میں جاب دلا دی...... پھر شادی ہو گئی۔ وہ جاب میری بے پروائیوں سے ہاتھ سے گئی تو باپ نے اپنے ریٹائرڈ ہونے کے بعد کی کل جمع پونجی لگا کر پرچون کی دکان ڈال دی۔ کچھ عرصے بعد باپ مر گیا۔ میں شاید محنت مشقت اور صبر و تحمل سے پیسہ کمانے کے لیے نہیں بنا تھا۔ میری مٹی میں جلد بازی اور کام چوری تھی لیکن مجھے پیسہ بھی بہت سا چاہیے تھا۔ پرچون کی دکان میں سے جتنا آتا میں کھاتا گیا۔ مزید مال ڈالنے کے لیے رقم جمع ہوتی تو وہ گھر پر یا میرے شوق پر خرچ ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ دکان بھی ختم ہو گئی۔ میں پھر فارغ ہو کر بیٹھ رہا۔

اب کچھ کرنے کو جی نہیں مانتا تھا ایک دن چوک پر کھڑا تھا کہ ایک فقیر پاس آیا۔ میں نے جھڑک دیا کہ بابا معاف کرو میرا تو اپنا حال فقیروں سے بدتر ہے۔ اس نے کہا تو پھر بھائی تم بھی ہمارے قبیلے میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے کہا مذاق نہ کرو...... مگر پھر اس نے سنجیدگی سے مجھے آفر کی اور یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ ایک معزز محلے میں گھر کرائے پر لے کر رہتا ہے۔ ذاتی موٹر سائیکل ہے۔ تین بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں اور محلے والے یہ جانتے ہیں کہ وہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہے۔

وہ گھر سے بہت دور کے علاقے میں بھیک مانگتا ہے تاکہ کوئی جاننے والا نہ ملے۔ شام کو یہ لباس فقیروں کے ایک اڈے پر جمع کرا دیتا ہے صبح صاف ستھرے گھر کے کپڑوں میں آتا ہے اور پھر "ڈیوٹی" کا لباس پہن کر "دھندے" پر نکل جاتا ہے۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"اس نے اپنے اڈے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ جب میرا موڈ ہو وہاں آ کر رحیم بخش سے مل لوں۔ میں کچھ

عرصہ اس طرف جانے سے گریز کرتا رہا پھر بالآخر جب کہیں ہاتھ نہ اڑا تو رحیم بخش کے پاس آیا۔ پہلے پہل اس لباس سے بہت کراہیت آئی۔ شرم سے آواز نہ نکلتی، ہاتھ نہ پھیلتے مگر پھر جب روز کا پانچ چھ سو روپیہ جیب میں آنے لگا تو خود بخود سارے گر آتے گئے۔ میں نے "دادا" کو رشوت دے کر سب سے زیادہ کمائی والا علاقہ لے لیا۔ جہاں روز کے ہزار بارہ سو بھی ہو جاتے تھے۔ بس پھر آہستہ آہستہ مکان، گاڑی، اور گھر کا ساز و سامان سب کچھ آ گیا۔"

"بہرحال، میں کسی فقیر کو بیٹی نہیں دوں گی۔" نجو بی اپنی بات پر اڑی رہیں اور وہاب صاحب بکتے جھکتے وہاں سے چلے آئے تھے۔

"ڈیوٹی" والی جگہ پر بیٹھے تو بیٹی اور بہن سے "ملاقات" ہو گئی۔ بس میں کل ہی "دادا" سے بات کرتا ہوں کہ میرے ان کے پاس جمع کیے ہوئے بیس ہزار روپے واپس کر دیں۔ میں اس دھندے کو چھوڑ رہا ہوں۔" انہوں نے ٹھان لیا۔

"یہ بیس ہزار کئی برسوں کی کٹوتی سے جمع ہوئے تھے۔ اکثر فقیر دادا کے پاس اپنی مخصوص رقم ہر ماہ جمع کراتے رہتے تھے۔ جب ضرورت پڑتی تو اپنی امانت لے لیتے۔ نہ ہوتی تو یہ بچت کے طور پر پڑے رہتے لیکن ابھی ایک اور ذلت ان کے نصیب میں لکھی تھی۔

☆☆☆

"کیا بات ہے دادی اماں، آپ کو ایک ماہ ہو گیا ہے ارشہ کے ہاں گئے ہوئے۔ دوبارہ جواب لینے نہیں گئیں آپ......!"

عاصم کو دادی اماں کی مسلسل چپ اور اس موضوع سے مکمل گریز نے بے چین اور پریشان کر ڈالا تھا۔ وہ اس طرف آتی ہی نہیں تھیں۔

"چلی جاؤں گی کسی روز۔" ان کا انداز جان چھڑانے والا تھا "تم فی الحال مجھے پرانے قلعے لے چلو۔ مجھے ثریا (ان کی سہیلی) سے ملنا ہے۔"

عاصم نے خاموشی سے گاڑی نکالی۔ راستے میں ایک چوک پر رش کی وجہ سے رکنا پڑا۔

کتنی بے مول
یہ ناری ہے
چٹکی بھر
سیندور کی خاطر
اپنا جیون
یہ ہاری ہے

شاعرہ: سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

"اللہ کے نام پر بابا...... کچھ دیتا جا......"

اور اگلے ہی لمحے وہاب صاحب کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ انہوں نے دادی اماں کو پہچان لیا تھا۔

دادی اماں کی گہری نظریں ان کے چہرے پر تھیں۔ وہاب صاحب ایک دم مڑے اور بھیڑ میں گم ہو گئے۔

"جانتے ہو یہ کون تھا......؟" اچانک دادی اماں نے مضمحل انداز میں سوال کیا۔

"کون۔" عاصم کی توجہ ڈرائیونگ پر تھی "فقیر تھا۔"

"یہ تمہارے ہونے والے سالے صاحب تھے۔ اریشہ کے بھائی!" دادی اماں نے گہری سانس لے کر گویا اپنی پُراسرار چپ کا پردہ چاک کیا تھا۔ عاصم کے آس پاس دھماکے ہونے لگے۔

"آ..... آپ کا مطلب ہے یہ..... یہ....." اس کے تو حواس ہی گم ہوگئے۔

"ہاں، جس دن تمہارا رشتہ مانگنے جانا تھا میں عاطف کے ساتھ ثریا کو لینے اس طرف آئی تھی۔ چوک پہ بیٹھے اس فقیر کی صدا پر میں نے کچھ نوٹ اس کی نذر کیے تھے۔ اس کی شکل بہرحال میرے حافظے میں تھی پھر شام کو اسی سے ملتے جلتے بھائی کے روپ میں صاف ستھرے "سیٹھ وہاب" بنے بیٹھے آدمی کو اریشہ کے ہاں بھائی کے روپ میں دیکھا۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ تصدیق کے لیے میں وہاب گارمنٹس گئی۔ پتا چلا اس شخص نے محض وہاب کا نام استعمال کر کے اپنی شخصیت کے اس رخ پر نقاب ڈال رکھا تھا لیکن پھر تم نے بتایا کہ چھ ماہ پہلے وہ یہ فیکٹری بیچ چکے تھے تو میں چپ ہوگئی لیکن آئینے میں جیسے کوئی بال آ گیا تھا۔ اس لیے تم دونوں سے ذکر نہیں کیا۔ بالآخر آج حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے، اریشہ اتنی بڑی بات مجھ سے کیسے چھپا سکتی ہے؟" وہ اس اعصاب شکن حادثے کی تاب نہیں لا پا رہا تھا۔

"یقیناً وہ بھی لاعلم ہوگی..... لیکن عاصم ہمارے گھرانے کی معاشرے میں ایک عزت ہے، ایک پہچان ہے۔ میں کسی پیشہ ور بھکاری کی بہن کو بہو بنا کر اپنے گھر میں نہیں لاسکتی۔ ساری عمر کا طعنہ اور نسلوں تک کی ذلت بن جائے گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ ہاں تم خود سے شادی کر کے لانا چاہو تو تمہاری مرضی..... میں اس معاملے میں کسی صورت شریک نہیں ہوں گی۔"

☆☆☆

"اریشہ، دو ماہ گزر گئے۔ عاصم کے گھر والے دوبارہ نہیں آئے۔ کیا خیال ہے میں اور تمہارے بھایا جی خود جا کر نہ مل آئیں اسی بہانے عاصم کو بھی دیکھ لیں گے۔" راحت العین نے گم صم بیٹھی اریشہ کو چونکا دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے بھابی۔" اس کا لہجہ رندھا ہوا تھا۔ راحت چونک کر اس کی متورم آنکھیں دیکھنے لگیں۔ چہرہ بری طرح ستا ہوا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ اس کا اجڑا اجڑا گم صم روپ ملاحظہ کر رہی تھیں۔

اریشہ نے خود کو جیسے سانجھ نگر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہاب صاحب نے ہمیشہ کے لیے اپنا "دھندا" چھوڑ دیا تھا۔ وہ دادا سے لی گئی رقم کو خیرات کر کے خود ایک اسٹور پر کام کرنے لگے تھے۔ گھر آ کر زیادہ تر نماز اور قرآن کی تلاوت میں مصروف رہتے۔ نور العین کو گہری چپ لگ گئی تھی۔ وہ سنجیدگی سے اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگئی تھی۔ طاہر چوری کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور اسے چھ ماہ کی جیل ہوگئی تھی۔

"کیوں، کیا طاہر کی وجہ سے.....؟" راحت چپ سی ہوگئیں۔

"نہیں..... انہوں نے بھایا جی کو دیکھ لیا تھا۔" وہ منہ پھیر کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

راحت العین دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا "ان کی وجہ سے تمہارا اتنا اچھا رشتہ، ایک بہترین مستقبل تباہ ہوا۔" وہ دکھ کی آنچ سے پگھلنے لگیں۔

"آپ غم نہ کریں بھابی، یہ سب میرا نصیب تھا۔" اس نے خود پر قابو پایا "امید کی ایک ننھی سی کرن روشن تو ہوگئی ہے ناں، بھایا جی ان راستوں سے پلٹ آئے ہیں۔"

"مگر ساری عمر گزار کے....." راحت پھوٹ پھوٹ کر رو دیں "تمہارا اور بچوں کا مستقبل تباہ کر کے، کیا فائدہ بعد از مرگ واویلا کرنے کا....." اور اریشہ کو وہ حدیث شریف یاد آ رہی تھی۔

"ایک انسان کا جنگل سے لکڑیوں کا گٹھا اپنی کمر پر لاد کر لانا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔" ایک "ہاتھ" پھیلا تھا اور کتنے سارے ہاتھوں میں چھپا مستقبل تباہ کر گیا تھا۔ وہ ایک "ہاتھ" پورے گھر کو بھسم کر گیا تھا۔

❄

عکس در عکس

اپنے چھوٹے سے گھر کی کھڑکی میں سے جھانکتے شمس علی کی نظریں بیچ بیچ قدم اٹھا کر گھر کی طرف بڑھتی حسینہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ گندمی رنگت پر تیکھے نقوش اور سیاہ گھٹاؤں جیسے بالوں کی مالکہ حسینہ صرف نام کی ہی نہیں بلکہ سچ مچ کی حسینہ تھی جس کا سانچے میں ڈھلا بدن شادی کے دس سال بعد بھی روزِ اول جیسا شاداب و پُرکشش تھا۔ دو بچوں کی پیدائش نے بھی اس بدن کی خوبصورتی کو ذرا نہ گہنایا تھا بلکہ وہ دس سال پہلے کے مقابلے میں قدرے گداز ہو کر پہلے سے بھی زیادہ پرکشش ہو گئی تھی۔ وہ چھتیس سال کی تھی لیکن اسے دیکھنے والے مشکل سے ہی تیس کا اندازہ لگا پاتے تھے۔ دس سال پہلے شمس علی جب اسے انڈیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے بیاہ کر لایا تھا تو اسے لگا تھا اس کی لاٹری نکل آئی ہے۔ حسینہ کے حسن نے اسے مدہوش سا کر دیا تھا حالانکہ حسینہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت نہیں تھی حسینہ سے شادی سے پہلے شمس علی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی پہلی بیوی رضیہ آٹھ سالہ رفاقت کے بعد دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت اسے داغِ مفارقت دے گئی تھی۔

رضیہ سے شمس علی کی پہلی بیٹی تھی جس کا نام ناجیہ تھا۔ ماں کی وفات کے وقت ناجیہ کی عمر تقریباً ساڑھے چھ برس کی تھی۔ دادی اور ماں کی زبانی جلد ہی کسی ننھے منے بھائی یا بہن کی آمد کی نوید سن کر جوش سے بھری ننھی سی ناجیہ کے لیے ماں کی موت بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی تھی۔ جس ننھے مہمان کے ساتھ وہ کھیلنے کودنے کے خواب دیکھتی تھی وہ ننھا مہمان ماں کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے دوسری دنیا میں لے گیا تھا۔ ناجیہ چند پل کے لیے دنیا میں آ کر اپنی ماں کو ساتھ لے جانے والے اس ننھے مہمان سے سخت شاکی رہتی تھی۔ اس کے دن کا زیادہ تر حصہ رو رو کر ماں کو پکارنے اور دادی سے بے جا ضدیں کرنے میں گزرتا تھا۔ دادی کے لیے اس عمر میں گھر کے کام کاج کے ساتھ ناجیہ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ دوسری طرف شمس علی کی اجاڑ صورت دیکھ کر بھی ان کا دل دکھتا تھا۔ انہوں نے اچانک ہی فیصلہ کیا کہ کچھ عرصے کے لیے انڈیا چلا جائے۔ انڈیا کے مختلف شہروں میں ان کے عزیز و اقارب بستے تھے اور دادی کا خیال تھا کہ کچھ عرصہ ان کے درمیان رہ کر شمس علی اور ناجیہ پر چھائی ماتمی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ یہ تو شمس علی کو مختلف عزیز و اقارب کے گھروں میں مختصر قیام کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم اپنے ماموں کے گھر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ماں کے اس دورۂ انڈیا کے پیچھے اصل وجہ کیا ہے؟ ماموں کی چھ عدد بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے بمشکل دو کو وہ اپنے گھر کا کر پائے تھے۔ وہ دو بھی زیادہ سکھ میں نہیں تھیں اور باپ کے گھر کی طرح سسرال میں بھی غربت زدہ زندگی گزار رہی تھیں۔ حسینہ بہنوں میں سب سے بڑی تھی، باوجود حسین ہونے کے چھبیس سال کی عمر میں بھی بن بیاہی ماں باپ کے در پر بیٹھی تھی۔ بقول ماموں کے جب کم عمری میں اس کے رشتے آتے تھے تو ان کے پاس اتنی گنجائش بھی نہیں تھی کہ جہیز کے نام پر بیٹی کو دو جوڑے اور چند برتن ہی دے سکیں۔ چنانچہ حسینہ کی عمر نکل گئی اور آنے والے رشتوں کا رخ اس کی چھوٹی بہنوں کی طرف مڑ گیا۔

اپنے گاؤں کے رواج کے مطابق اوور ایج ہو جانے والی حسینہ کے لیے جب شمس علی کی ماں نے بھائی کے سامنے دامن پھیلایا تو انہوں نے ہاں کرنے میں لمحہ بھی نہ لگایا۔ رشتوں کی کمیابی، غربت اور بیٹی کی تیزی سے بڑھتی عمر نے انہیں شمس علی اور حسینہ کی عمروں کے درمیان موجود فرق سے، شمس علی کے رنڈوے ہونے اور بیٹی کے اتنی دور چلے جانے تک کچھ بھی نہیں سوچنے دیا تھا یوں شمس علی حسین و جمیل حسینہ کو بیاہ کر اپنے ساتھ پاکستان لے آیا۔ حسینہ کے ساتھ نے پہلے اسے رضیہ کی موت کا غم بھلایا اور پھر اس کے بطن سے جنم لینے والے دو بیٹوں میں گھر کر وہ دنیا میں چند سانسیں لے کر واپس پلٹ جانے والے اپنے بیٹے کا ملال بھی بھول گیا۔ شمس علی کی ماں بھی اس شادی کے چار برس بعد معمولی بخار، کھانسی کے چند دن کاٹ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ ماں کی موت کو شمس علی نے ایک معمول کے حادثے کی طرح قبول کر لیا۔ ناجیہ کچھ دن اداس رہی، پھر بہل گئی۔ یوں بھی وہ ان چار سالوں میں حسینہ کے بہت قریب آ گئی تھی۔

حسینہ کو جانے کیا جادو آتا تھا کہ ہر ایک کو اپنا بنا لیتی تھی۔ شمس علی اس کی رفاقت میں بے حد خوش اور مطمئن تھا۔ گھر کا نظام بھی بخیر و خوبی چل رہا تھا کہ شادی کے نویں سال وہ منحوس واقعہ پیش آ گیا۔ مل میں کام کے دوران شمس علی کا دایاں ہاتھ مشین میں آ کر ضائع ہو گیا۔ مل مالکان نے علاج معالجے کے علاوہ معمولی رقم دے کر شمس علی کو نوکری سے فارغ کر دیا۔ مل سے ملنے والی وہ معمولی رقم گھر کا چولہا کب تک روشن رکھتی۔ آخر نوبت فاقوں کے قریب آ پہنچی ایسے میں حسینہ نے کمر ہمت کسی اور گھر سے باہر نکل کر نوکری کرنے کا فیصلہ کیا۔ شمس علی کے لیے حسینہ کا نوکری کرنا بہت تکلیف دہ تھا لیکن مجبوری ایسی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شمس علی نے اپنی ہی مل میں ایک جاننے والے ٹھیکیدار سے بات کر کے حسینہ کو دوسری عورتوں کے ساتھ دھاگہ بھرنے

کاٹنے اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کاموں پر لگوا دیا۔ حسینہ روزانہ صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک مل میں کام کرنے لگی اور یوں اس کی معمولی آمدنی نے گھر والوں کو فاقہ کشی سے بچالیا۔ شمس علی نے بھی ہمت پکڑی اور گھر پر بچوں کے ساتھ کاغذ کے لفافے بنانے کا کام کرنے لگا۔ شمس علی کا تو ویسے بس نام ہی تھا ورنہ اصل محنت بچے ہی کرتے تھے۔ شمس علی تو اکثر اپنے مجروح ہاتھ میں وقت بے وقت اٹھنے والے درد کے باعث کام کرنے سے معذور ہی رہتا تھا۔ پھر اس کے ایک ہاتھ سے کیے گئے کام کی وقعت ہی کیا تھی۔ جتنی دیر میں بچے تین درجن لفافے بنا لیتے اتنی دیر میں شمس علی مشکل سے ایک درجن لفافے ہی بنا پاتا تھا۔ بہرحال پھر بھی کسی نہ کسی طرح زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل پڑی تھی۔ شمس علی بھی بہت جلنے کڑھنے کے بعد کسی حد تک قسمت پر شاکر ہو کر پرسکون ہو گیا تھا کہ ایک چھوٹے سے واقعے نے اس پرسکون جھیل کے پانی میں گرنے والے پتھر کے مانند ارتعاش پیدا کردیا۔ حسینہ کام کے دوران ایک دن گرمی کی شدت سے مل میں بے ہوش ہو گئی۔ ٹھیکیدار نے اسے اپنے بائیس تیئیس سالہ بیٹے کے ساتھ جسے وہ ان دنوں کام سکھانے کی غرض سے اپنے ساتھ مل لانے لگا تھا، گاڑی میں گھر بھجوا دیا۔ ٹھیکیدار کی یہ ہمدردی شمس علی کو بہت مہنگی پڑی۔ اب ہونے یہ لگا تھا کہ ہفتے عشرے میں ایک دن حسینہ ضرور ہی ٹھیکیدار کے بیٹے کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر آتی۔ کبھی کبھی لڑکا گھر کے اندر بھی آتا اور چائے کی پیالی چڑھانے کے دوران خوش گپیاں کرتا رہتا۔ حسینہ اس کے الٹے سیدھے چٹکلوں پر بہت دل کھول کر ہنستی تھی۔ نابیہ کے ہونٹوں پر بھی شمس علی کو دبی دبی سی مسکراہٹ دکھائی دے جاتی تھی۔ دونوں بیٹے بھی اس لڑکے کی آمد سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک اکیلا شمس علی ہی تھا جو اس صورتحال پر کڑھتا رہتا تھا کیونکہ وہ اکیلا ہی یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ حسینہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ حسینہ کی اس بدلتی روش کے بعد ہی شمس علی نے یہ معمول بنالیا تھا کہ وہ اس کے مل سے واپس آنے کے وقت گھر کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا تاکہ جان سکے کہ وہ اکیلی آئی ہے یا ٹھیکے دار کے لڑکے کے ساتھ۔ لڑکا بہرحال ہر بار گھر کے اندر نہیں آتا تھا۔

آج بھی شمس علی اپنی معمول کی نگرانی کے لیے ہی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ حسینہ آج پھر لڑکے کے ساتھ اس کی گاڑی میں آئی تھی۔ لڑکا حسینہ کے ساتھ گاڑی سے نہیں اترا تھا لیکن اس کی نظریں حسینہ کے تعاقب میں تھیں۔ شمس علی جانتا تھا کہ ہمیشہ ساڑھی پہننے والی حسینہ، جس کی ساڑھی کا پلو اس کی پتلی کمر پر کچھ سرکا رہتا تھا، جب اپنی مخصوص لچکیلی چال چلتی ہوئی قدم اٹھاتی ہے تو اس کی سیاہ بل کھاتی ہوئی ناگن سی چوٹی کتنے ردھم سے کسی گھڑی کے پنڈولم کی طرح اس کی پشت پر متحرک رہتی ہے۔ ٹھیکیدار کے بیٹے کی نظریں بھی شاید اسی دلفریب نظارے میں الجھ کر پلٹنا بھول گئی تھیں اور اس نے حسینہ کے اتر جانے کے باوجود گاڑی آگے نہیں بڑھائی تھی۔ شمس علی اپنی جگہ کھڑا کھڑا مارے طیش کے بل کھاتا رہا۔ اس کے بس میں ہوتا تو اس بدتمیز لڑکے کی آنکھیں پھوڑ ڈالتا۔ مگر بس ہی تو نہیں چلتا تھا۔ اندر ہی اندر جوش مارتے غصے کی شدت کے دوران اس نے بیرونی دروازے پر دی جانے والی دستک اور نابیہ کے دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ لکڑی کا سالخوردہ دروازہ تیز چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی شمس علی نے لڑکے کو رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھا اور پھر لمحے بھر میں وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ہوا ہو گیا۔ شمس علی اس کے اس انداز پر فقط اپنے اکلوتے سلامت ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ انٹرویو کے لیے آنے والی تیسری لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر معظم چونک سا گیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی یہ لڑکی پہلے انٹرویو دے کر جانے والی دونوں لڑکیوں کے مقابلے میں بہت سادہ اور معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا دھلا دھلایا میک اپ سے بے نیاز چہرہ گواہ تھا کہ اسے کسی دفتر میں ملازمت کا تو کجا، انٹرویو دینے کا بھی تجربہ نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ اس کی حرکات و سکنات میں موجود گھبراہٹ سے بھی لگایا جاسکتا تھا۔ مگر معظم ان وجوہ کی بنا پر نہیں چونکا تھا۔ اس کے چونکنے کی وجہ وہ احساس مانوسیت تھا جو لڑکی کو پہلی نظر دیکھتے ہی اس کے دل میں ابھرا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر نظریں جمائے وہ اس احساس کی وجہ کھوج رہا تھا۔ اس کھوج میں اسے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ لڑکی اس کے یوں مسلسل خود کو گھورنے پر پزل ہو رہی ہے یا یہ کہ اس کے ساتھ انٹرویو کی اس کارروائی میں شریک منیجر اس کے خلاف معمول انداز پر حیران و پریشان ہے۔ اس بات کا احساس اسے اس وقت ہوا جب منیجر نے لڑکی کے ڈاکومنٹس پر مشتمل فائل اس کے سامنے رکھی۔ وہ چونکا، سیدھا ہوا اور پھر انٹرویو کا آغاز کیا۔

"آپ کا نام؟" معظم نے

"کنول منیر" لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

رہا تھا طنز سے بولا۔

''وہ تو چھوٹے شاہ صاحب کی مہربانی ہے ابا، جو کبھی کبھار اماں کو اپنی گاڑی میں چھوڑ جاتے ہیں پر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اماں کوئی افسر لگ گئی ہے۔ ذرا دیکھا کرو جب گھر واپس آتی ہے تو سر کے بالوں اور ساڑھی پر کتنا رواں چپکا ہوتا ہے۔'' ناجیہ نے فوراً حسینہ کی حمایت کی۔

''جادوگرنی! ہر ایک کو اپنا دیوانہ بنا لیتی ہے۔'' شمس علی لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے زیرلب بڑبڑایا۔ پھر منہ میں موجود لقمے کو دو تین دانت مار کر چبانے کی رسم پوری کرنے کے بعد نگلتے ہوئے بہ آوازِ بلند ناجیہ کو جھڑکنے کے انداز میں بولا۔

''جا جا۔ زیادہ چچہ گیری مت کر ماں کی۔ مجھے سب پتا ہے کہ یہ جو تیری ماں کبھی کبھی چوڑی بندے لا کر دے دیتی ہے تجھے، یہ ساری محبت اسی کا لالچ ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ابا! تم غلط سمجھ......'' ناجیہ جلبلا کر صفائی دینے لگی تھی کہ چنگیر میں میٹھا پراٹھا لے کر آتی حسینہ نے اشارے سے اسے چپ ہو جانے کو کہا۔ شمس علی کی طنزیہ باتیں اس چھوٹے سے گھر کے باورچی خانے میں اس تک پوری طرح پہنچی تھیں لیکن وہ سمجھتی تھی کہ مزاج کا یہ تیکھاپن شمس علی کی معذوری، تکلیف اور بیکاری کے باعث ہے اس لیے اس کی ایسی باتوں کو ہر بار نظر انداز کر جاتی تھی۔ اس بار بھی وہ شمس علی کی کڑوی بات کو درگزر کر گئی۔ ناجیہ بھی اس کا اشارہ پا کر خاموش ہو کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انور تو پہلے ہی اس گفتگو سے بے نیاز کھانے میں منہمک تھا، اظہر بھی اپنا من پسند میٹھا پراٹھا پا کر اس کے مزے میں گم ہو گیا۔ کھانا بے حد خاموشی سے کھایا گیا۔ شمس علی نے اپنی معمول کی خوراک سے بہت کم روٹی کھا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''ناجیہ! دودھ ہے تو ذرا گرم کر کے ایک کپ میں اپنے ابا کے لیے نکال دے۔''

ناجیہ کے ساتھ دسترخوان سمٹوا کر حسینہ نے باورچی خانے میں چیزیں ٹھکانے پر رکھتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

''دودھ ہے تو اماں! مگر صرف ایک ہی کپ۔ صبح چائے کے لیے پریشانی ہو جائے گی۔''

ناجیہ نے جھجکتے ہوئے حسینہ کو صورتِ حال بتائی۔ تو وہ خود بھی قدرے تذبذب میں پڑ گئی۔ تنخواہ ملنے میں ابھی بیچ کا ایک دن باقی تھا اور حسینہ کے پاس محض اتنے ہی روپے بچے تھے کہ کل کے دن ڈیوٹی پر جانے آنے کے لیے بس کا کرایہ

اشتہارات

ضرورت ہے ایک ایسے مولوی صاحب کی جو ہمارے خاندان بھر کی خوشیوں، مسرتوں اور کامیابیوں کے لیے دعا کر سکیں۔ بالخصوص بیرون ملک کے ویزے اور لوڈشیڈنگ کے لیے دعا کرنے کا جنہیں وسیع تجربہ ہو اور جن کی دعا میں تاثیر ہو، ذیل کے پتے پر رجوع کریں۔ وظیفہ حسب قبول دعا دیا جائے گا۔

☆☆☆

اگر آپ دل پھینک واقع ہوئے ہیں تو آج ہی ہمارے شوروم میں تشریف لا کر اپنی پسند کے بہترین ''دل'' خریدیے اور روزانہ کسی نہ کسی کو ایک دل دیجیے۔ ایک سے زیادہ سیٹ کے خریداروں کے لیے خصوصی رعایت۔ یاد رکھیے! ہمارے ہاں بہترین پلاسٹک کے ''دل'' بنائے جاتے ہیں۔

دے سکتی۔

''صبح اور دودھ منگوا دوں گی۔ تو یہ دودھ اپنے ابا کے لیے نکال دے۔'' پل بھر کی سوچ کے بعد حسینہ نے سر جھٹکتے ہوئے ناجیہ کو حکم دیا۔ وہ ایک دن بس کے بجائے پیدل بھی چل جا سکتی تھی۔ بس اس کے لیے اسے معمول سے آدھے گھنٹے پہلے گھر سے نکل کر اس شارٹ کٹ کو استعمال کرنا پڑتا جسے وہ اس کی ویرانی کے باعث استعمال کرنے سے گریز ہی کیا کرتی تھی۔ ناجیہ نے اس کے حکم کی تعمیل میں چپ چاپ دودھ گرم کر کے کپ میں نکال دیا۔ حسینہ کپ لے کر اس کمرے میں چلی گئی جس میں اس کا اور شمس علی کا بسیرا تھا۔ دوسرے کمرے میں ناجیہ اور دونوں بیٹے سوتے تھے۔ شمس علی چارپائی پر اپنا بایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھے چت لیٹا تھا۔ اس کی نظریں اپنے دائیں ہاتھ پر جمی تھیں جسے کہنی سے ذرا نیچے سے کاٹ دیا گیا تھا۔

''یہ دودھ پی لو۔'' حسینہ، شمس علی کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے قریب جا کر ملائمت سے بولی۔

''دودھ...... کس نے کہا تھا تجھ سے یہ دودھ لانے کو؟'' شمس علی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ لہجے سے چڑچڑاپن اب بھی جھلک رہا تھا۔

''کسی نے نہیں کہا تھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم نے کھانا صحیح سے نہیں کھایا اسی لیے میں تمہارے لیے یہ دودھ لے آئی۔'' حسینہ اپنے لہجے کی نرمی کو قائم رکھتے ہوئے آہستہ سے چارپائی پر پائینتی کی جانب ٹک گئی۔ شمس علی بھی اب لیٹے سے

اٹھ بیٹھا تھا۔

''مجھے نہیں پینا یہ دودھ۔'' شمس علی نے کسی بچے کی طرح منہ پھلا کر انکار کیا۔

''کیسے نہیں پینا؟ میں تو پلا کر ہی رہوں گی۔'' حسینہ نے ناز سے کہتے ہوئے کپ شمس علی کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس بار شمس علی مزاحمت نہیں کر سکا اور چپ چاپ حسینہ کے ہاتھوں سے دودھ پی لیا۔ وہ یونہی تو اسے جادوگرنی نہیں کہتا تھا، اسے معلوم تھا کہ حسینہ کا قرب کیسے لمحوں میں بندے کو پگھلا دیتا ہے۔ وہ پچھلے دس سال سے بہ خوشی اس کے سامنے پگھلتا رہا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے دل میں ایک پھانس اٹک گئی تھی۔ اس پھانس کی دکھن اپنے کٹے ہوئے ہاتھ اور دن بہ دن لاغر ہوتے جسم کو دیکھ کر کچھ اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ اب پھر وہ بے خیالی میں اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا۔ اس کے ٹنڈ منڈ حصے پر اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیر رہا تھا۔

''کیا درد ہو رہا ہے ہاتھ میں؟'' حسینہ نے فکر مندی سے پوچھتے ہوئے خود اپنی انگلیاں اس جگہ رکھیں جہاں شمس علی کی انگلیاں متحرک تھیں۔ اس کی انگلیوں کے اعجاز مسیحائی کو محسوس کرتے ہوئے شمس علی نے نفی میں گردن ہلائی اور پھر شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ''تجھے کیا پروا میرے درد کی؟ تجھے تو دوسرے دھندوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔''

''تیری فکر کیسے نہیں ہوگی مجھے، پر دوسرے دھندے بھی تو زندگی کی ضرورت ہیں۔'' حسینہ نے یاسیت بھری مسکراہٹ سے شمس علی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ چپ سا ہو گیا۔ خاموشی کا یہ وقفہ دو منٹ پر مشتمل تھا جسے شمس علی کی آواز نے توڑا۔

''میری ایک بات مانے گی حسینہ؟'' وہ متذبذب سا حسینہ سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ کیا؟'' حسینہ پر دن بھر کی تھکن سوار ہونے لگی تھی لیکن وہ شمس علی کی دلجوئی کے لیے خود پر جبر کیے بیٹھی تھی۔

''تو ساڑھی چھوڑ کر شلوار قمیص پہننا شروع کر دے۔'' شمس علی کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا لیکن فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

''ساڑھی چھوڑ دوں؟ گیارہ سال کی عمر سے یہی پہن رہی ہوں کبھی اس کے سوا کچھ اور پہنا ہی نہیں۔ اب تو کچھ اور پہننے کا خیال ہی عجیب لگتا ہے۔ پر تم بتاؤ، تمہیں اچانک یہ کیا سوجھی؟'' حسینہ حیران حیران نظروں سے شمس علی کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اچانک نہیں سوجھی۔ بہت عرصے سے سوچ رہا تھا کہ تجھ سے یہ بات کروں۔ اب دیکھ ناں پہلے کی بات اور تھی۔ تو دن بھر گھر میں رہتی تھی پر اب تو تجھے باہر نکل کر مردوں کے درمیان کام کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں یہ پہناوا کچھ مناسب نہیں لگتا۔'' شمس علی کچھ خجل سا اپنی بات کی وضاحت دینے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ناجیہ سے کہوں گی کہ میری ساڑھیوں کو کاٹ کر میرے لیے شلوار قمیص سی دے۔ وہ آج کل سامنے والی چاچی سے سلائی کٹائی کا کام سیکھ رہی ہے۔ اچھا ہے اسے بھی ہاتھ کی صفائی کا موقع مل جائے گا۔'' حسینہ نے زیادہ بحث کیے بغیر شمس علی کی بات مان لی کہ نیند سے بوجھل ہوتی پلکیں اب اس بات کی اجازت بھی نہیں دے رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ ہر طرف سے بے نیاز چارپائی پر لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ شمس علی اپنی چارپائی پر بیٹھا اس کے حشر ساماں وجود کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وجود پچھلے دس سال سے اس کی نیندیں اڑاتا آ رہا تھا لیکن آج نیند اڑنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ شمس علی ہلکان تھا کہ اپنے اس قیمتی خزانے کو کیسے کسی اور کی دسترس میں جانے سے بچائے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس دولت کے لٹ جانے کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ حسینہ آج پھر ٹھیکیدار کے بیٹے کی گاڑی میں گھر لوٹی تھی اور شمس علی کی نظروں نے پھر وہ منظر دیکھا تھا جس کی کھولن وہ اپنے پورے وجود میں محسوس کرتا تھا۔

☆☆☆

کنول کے گھر پہنچنے والا اپائنٹمنٹ لیٹر ایک غیر متوقع خوشی کے مانند تھا۔ تین سوالوں پر مشتمل انٹرویو سے کنول نے قطعی کوئی امید نہیں باندھی تھی۔ وہ تو انٹرویو دینے بھی محض اس لیے چلی گئی تھی کہ مطلوبہ اہلیت نہ رکھنے کے باعث جب اسے ریجیکٹ کیا جاتا تو وہ ان لوگوں سے فیکٹری میں کسی اور جاب کے لیے اپنے تقرر کی درخواست کرتے ہوئے قسمت آزمائی کرتی لیکن باوجود خواہش کے انٹرویو لینے والوں کے سامنے اس کی زبان نہیں کھل سکی تھی۔ فیکٹری کے مالک کے رویے نے اسے بری طرح کنفیوز کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بری طرح گھورنے لگا تھا مگر یہ گھورنا ویسا نہیں تھا جس سے کنول کو کسی بدنیتی کا احساس ہوتا۔ کم عمر ہونے کے باوجود وہ عورتوں کی مخصوص حس کے تحت خود پر پڑنے والی نظروں کا انداز سمجھنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس شخص کے گھورنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کنول کو دیکھ کر اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور پہچان نہ پا رہا ہو۔ کنول کو اس بات پر حیرت تھی کیونکہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا اور فیکٹری کے مالک کا زندگی میں کبھی بھی ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوا، سامنا ہونے کا سوال

ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ایک فیکٹری کے مالک اور سبزی فروش کی بیٹی کا حلقۂ احباب یقیناً قطعی مختلف تھا چنانچہ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کا کہیں کسی محفل میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہوا ہو۔ کنول البتہ غائبانہ طور پر کسی حد تک معظم سے متعارف تھی۔ اس کے محلے میں ہی رہنے والی ایک لڑکی کوثر اپنی شادی سے قبل اس فیکٹری میں بطور سپروائزر نوکری کرتی رہی تھی۔ دورانِ ملازمت کوثر کی زبان سے اپنے فیکٹری کے مالک معظم کے لیے تعریفی کلمات ادا ہوتے رہتے تھے۔ ملازمین کو وقت پر تنخواہوں کی ادائیگی سے لے کر معظم کی ذاتی شرافت تک کے قصے کنول نے کوثر کی زبان سے سن رکھے تھے چنانچہ جب اس نے اخبار میں ''ضرورت ہے'' کے کالم میں اس فیکٹری میں سیکریٹری کی جاب کے بارے میں پڑھا تو زیادہ سوچ بچار کیے بغیر وہاں جا پہنچی اور اب حیرت انگیز طور پر اس کا تقرر بھی ہو چکا تھا۔

''کنول باجی! تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے آپ مجھے نیا یونیفارم دلا دیجئے گا۔ سچ بڑی شرم آتی ہے اس پھٹے پرانے یونیفارم کو پہن کر اسکول جاتے ہوئے۔'' کنول سے چھوٹی سنبل نے، جو کنول کو نوکری مل جانے کی نوید سن کر خود بھی بے حد خوش تھی فوراً ہی فرمائش جڑ دی۔ ''جی نہیں۔ کنول باجی پہلے مجھے جوتے دلائیں گی۔ ویسے بھی تمہارا تو اب اسکول میں آخری سال ہے۔ تم کیا کرو گی نیا یونیفارم لے کر؟'' بارہ سالہ جواد نے فوراً ہی سنبل کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی فرمائش بیان کی۔

''آخری سال ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں پورا سال وہ سڑا بھسا یونیفارم پہن کر اسکول جاتی رہوں۔ بس میں نے بتا دیا ہے کہ مجھے نیا یونیفارم لینا ہے تم اپنے جوتے اگلی تنخواہ پر لے لینا۔'' سنبل نے بھی جیسے اٹل فیصلہ سنایا۔

''ارے کم بختوں! پہلے تنخواہ کی نوبت تو آنے دو۔ ابھی بہن نوکری پر پہنچی نہیں ہے اور یہ لگے ہیں لڑائیاں کرنے۔ جیسے کل فیکٹری جاتے ہی وہ لوگ سب سے پہلے تمہاری بہن کے ہاتھ پر تنخواہ ہی رکھیں گے۔'' سر پر پٹی باندھے لیٹی درد سے نڈھال ہوتی ان کی ماں سے زیادہ دیر یہ بحث برداشت نہ ہو سکی اور اس نے ان دونوں کے لتے لینے شروع کر دیے۔

''رہنے دیں نا امی! بچے ہیں پھر ایسی غلط فرمائشیں بھی نہیں کر رہے۔ میں خود کتنے دنوں سے محسوس کر رہی ہوں کہ انہیں ان چیزوں کی ضرورت ہے۔'' کنول نے نرمی سے ماں کو ٹوکتے ہوئے بہن بھائی کی سائڈ لی۔

''اب اتنے بھی بچے نہیں کہ گھر کے حالات نہ سمجھ سکیں۔ سنبل تو تم سے تین، ساڑھے تین سال ہی چھوٹی ہے مگر سمجھ عقل نام کو نہیں۔'' ماں کی اس بات پر کنول نے خاموشی اختیار کر لی۔ سنبل اور جواد بھی شرمندہ شرمندہ سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہ سچ تھا کہ گھریلو حالات واقعی اس نہج پر آ پہنچے تھے کہ اس قسم کی ضروریات کو پورا کرنا بھی عیاشی میں شمار ہونے لگا تھا۔ پانچ سال قبل باپ کی زندگی میں ان لوگوں کو اتنی محرومیوں کا سامنا نہیں تھا۔ بلکہ نہیں، معاملہ چھ سال قبل بگڑا تھا۔ جب دمے کا پرانا مرض ان کے باپ منیر احمد کو چارپائی پر لے آیا تھا۔ ایک سال کا عرصہ منیر احمد نے چارپائی پر پڑے پڑے گزارا تھا۔ اس عرصے میں کمائی کا ذریعہ ختم ہونے کے ساتھ ساتھ، جمع پونجی بھی ٹھکانے لگ گئی تھی۔

منیر احمد کے گزرنے کے بعد ان کی ماں نے سلائی مشین سنبھالی تھی۔ ماں کے اس ہنر کے سبب ہی گھر کا چولہا بھی روشن رہا تھا اور ان بھائی بہنوں کا تعلیمی سلسلہ بھی، بھلے سرکاری اداروں میں ہی سہی جاری رہا تھا۔ کچھ امداد ماموؤں کی طرف سے بھی مل جاتی تھی۔ بڑے ماموں دبئی میں تھے۔ چھ آٹھ ماہ میں ان کی طرف سے چھوٹی موٹی رقم کا ڈرافٹ مل جاتا تھا۔ چھوٹے ماموں جنہوں نے ابا کے انتقال کے بعد ان کی سبزی کی دکان سنبھالی تھی ان کے بعد دو سال تک ماہانہ کچھ رقم پابندی سے دیتے رہے تھے۔ پھر ماموں کی، ماں نے شادی کروا دی۔ چھوٹے ماموں جوان لوگوں کے ساتھ ہی رہتے تھے، شادی کے چھ ماہ بعد ان سے الگ ہو گئے۔ الگ ہونے کے بعد ماہانہ دی جانے والی خرچے کی رقم پہلے سہ ماہی اور ششماہی پر پہنچی اور پھر یہ سلسلہ ہی بند ہو گیا۔ ماموں کے پاس معقول بہانہ تھا کہ اب ان کے اپنے بیوی بچے ہیں اور ان کے لیے اپنے اخراجات پورے کرنا ہی مشکل ہوتا ہے تو وہ بہن اور اس کے بچوں کی امداد کیونکر کریں۔ بے چاری بہن یہ بھی نہیں جتا سکی تھی کہ امداد بے شک نہ کرو لیکن اس دکان کا کرایا دے دیا کرو جو میرے شوہر کی ملکیت ہے اور جس پر تم مزے سے قبضہ کیے بیٹھے ہو۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے اس کی سلائی مشین کا پہیا کہاں تک مقابلہ کرتا۔ جبکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ محنت کی زیادتی اس کے قویٰ کو کمزور کرتی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ گھریلو حالات ابتری کا شکار ہوتے چلے گئے۔ شکر یہ تھا کہ اس عرصے میں کنول نے بی۔ اے کا امتحان دینے کے ساتھ ساتھ ٹائپنگ اور کمپیوٹر کا ایک چھوٹا

مونا کورس بھی کرلیا تھا اور گھریلو حالات کے سدھار کے لیے نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوگئی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی یہ تلاش جلد ہی تمام ہوگئی۔ اب وہ مطمئن تھی کہ جلد اس قابل ہوجائے گی کہ گھر کی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ چھوٹے بھائی اور بہن کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو پورا کرسکے۔

☆☆☆

معظم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور کھڑی تھی۔ زندگی کی بہت سی تلخیوں کو کشادہ دلی سے سہہ جانے والا معظم اپنے رتجگوں کا حل کبھی نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔ آج وہ جس حیثیت کا مالک تھا یہ حیثیت اسے باپ دادا کی طرف سے طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کی گئی تھی۔ خود کو اس مقام تک پہنچانے کے لیے اس نے دن رات تگ و دو کی تھی۔ وہ دن میں کئی کئی گھنٹے بے تکان کام کرنے کے بعد اپنے موجودہ مقام پر پہنچا تھا یا پھر شاید بات یہ تھی کہ وہ اس مقام تک پہنچا ہی اس لیے تھا کہ اس نے کام کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ درحقیقت اس نے اس مقام کو پانے کی کبھی بہت زیادہ خواہش نہیں کی تھی لیکن "لاحاصل" کی اذیت سے بچنے کے لیے اختیار کی جانے والی مصروفیات سے اسے بہت کچھ "حاصل" ہوگیا تھا۔ اس حاصل میں سرفہرست وہ گارمنٹس فیکٹری تھی جس کا وہ آج بلاشرکت غیرے مالک تھا۔ فیکٹری کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ وہ لوگ لوکل مارکیٹ میں مال سپلائی کرنے کے ساتھ ساتھ ایکسپورٹ بھی کیا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر معظم ایک بہت کامیاب انسان تصور کیا جاتا تھا جس نے اپنے بل بوتے پر اتنی ترقی کی تھی لیکن خود معظم کا دل سچی خوشی کے احساس سے عاری تھا اور آج یہ احساس کنول کو دیکھ کر دوچند ہوگیا تھا۔ کنول نے پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ معظم کا دل چاہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنے سامنے بٹھا کر بس دیکھتا ہی چلا جائے۔ شاید اسی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے مطلوبہ اہلیت پر پورا نہ اترنے کے باوجود کنول کو اپنی سیکریٹری کی پوسٹ پر اپائنٹ کرلیا تھا۔ اپنا یہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا وہ کبھی بھی دل پھینک آدمی نہیں رہا تھا۔

اس کی نوجوانی کے دنوں کی بھی بس ایک ہی رنگین یاد تھی جسے وہ بیس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد فراموش کرچکا تھا۔ پھر اس "شاذ" کو یاد بنائے رکھنے کے لیے اس کے پاس کوئی معقول وجہ بھی تو نہیں تھی۔ مختصر عرصے پر محیط نوجوانی کی وہ محبت زبان سے اظہار کا مرحلہ طے ہونے سے قبل ہی بہت تیزی سے اس کی زندگی سے خارج ہوگئی تھی۔ اس کے بعد حالات نے کبھی معظم کو اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اس لطیف جذبے کو محسوس کرپاتا۔ مگر اب بیس سال بعد جبکہ وہ اپنی عمر کے چینتالیس سال گزار چکا تھا کنول منیر کو دیکھ کر اس کے دل پر وہی مانوس سی دستک ابھری تھی جس کی وہ اس عمر میں قطعی توقع نہیں کررہا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ کنول کو دیکھتے ہی دل میں ابھرنے والا احساس شناسائی دراصل کنول کے چہرے کے لیے نہیں بلکہ اس دستک کے لیے تھا جو برسوں بعد اس نے سنی تھی۔ اس دستک پر معظم نے بہت تیزی سے ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کنول کے لیے دروازے وا کردیے تھے لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس سے غلطی ہوئی ہے۔ عمر کے اس حصے میں جبکہ وہ خود ایک جوان ہوتی ہوئی بیٹی کا باپ تھا اسے خود سے تئیس، چوبیس سال چھوٹی لڑکی کے لیے ایسی بے تابی دکھانے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ اس عمر میں اس قسم کی جذباتیت جگ ہنسائی اور رسوائی کا سبب بھی بن سکتی تھی لیکن اب کیا، کیا جاسکتا تھا۔ کنول کو اس کی ہدایت پر اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوایا جاچکا تھا۔ یقیناً آنے والی صبح معظم اسے اپنے آفس کے ساتھ والے کیبن میں دیکھتا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کی بس ایک ترکیب تھی کہ معظم کل کنول کے آنے پر اسے اپنی سیکریٹری کی جگہ دینے سے معذرت کرلے اور فیکٹری میں کسی اور معقول جاب کی آفر کردے۔ اس طرح وہ ہر گھڑی کنول کا سامنا کرنے سے بچ سکتا تھا۔ اس فیصلے پر پہنچ کر معظم نے قدرے اطمینان محسوس کیا اور بیڈ کی سائڈ دراز میں سے نیند کی گولیوں کی شیشی نکال کر اس میں سے ایک گولی پانی کی مدد سے نگل لی۔ اب وہ اپنے تھکے ہوئے جسم کے لیے کچھ دیر آرام کا خواہاں تھا لیکن گولی حلق سے نیچے جاتے ہی بستر پر اس کے بائیں جانب موجود وجود میں ہلچل سی ہوئی۔ بائیں جانب موجود وہ عورت اس کی بیوی تھی جو کھانسی کے شدید ترین دورے کے سبب سوتے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ معظم نے اس کی ابتر ہوتی حالت پر دکھ محسوس کرتے ہوئے سائڈ میں رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے لبوں سے لگایا اور اس کی پشت کو بائیں ہاتھ سے سہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی حالت سنبھل گئی۔

"تمہاری کھانسی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ کتنی بار میں نے تم سے کہا ہے کہ ڈاکٹر انصاری سے اپنا مکمل چیک اپ کروالو لیکن تم میری بات پر توجہ ہی نہیں دیتی ہو کل میں خود ان سے اپائنٹمنٹ لے کر تمہیں ڈرائیور کے ساتھ وہاں بھجواؤں گا۔" پانی کا گلاس واپس جگ پر رکھتے ہوئے معظم

نے خفا سے لہجے میں بیوی سے کہا تو وہ بجھے بجھے انداز میں مسکرا دی اور پھر بولی۔

"آپ فضول میں پریشان ہو رہے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سا کھانے کے ساتھ اچار کھا لیا تھا اس لیے گلے میں خراش پڑ گئی۔ اسی کی وجہ سے کھانسی ہو رہی ہے۔ ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

"بہانے میں بہت عرصے سے سن رہا ہوں کہ یہ کھا لیا تھا تو کھانسی ہو گئی، وہ پی لیا تھا تو کھانسی ہو گئی لیکن اب مجھے ان بہانوں پر یقین نہیں آتا۔ تم کتنا کھانے پینے والی ہو اس کا اندازہ تمہیں دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے۔ بلکہ تم خود بھی یہ بات سمجھتی ہو کہ ان گزرے برسوں میں تمہارا حال کیا سے کیا ہو چکا ہے؟" معظم بدستور خفا تھا۔ شاید کچھ اس لیے بھی مزاج زیادہ برہم ہو رہا تھا کہ اب جبکہ وہ سونے کا ارادہ رکھتا تھا تو، مجبوری کے باعث جاگنا پڑ رہا تھا۔

"آپ آج ابھی تک سوئے کیوں نہیں؟ ساڑھے چار بجنے والے ہیں۔ کیا سونے کا ٹائم ڈھائی تین سے آگے بڑھ کر اس وقت تک آ پہنچا ہے؟" وہ یقیناً اپنی ذات کو موضوعِ گفتگو بنانے سے گریزاں تھی اس لیے گھڑی کی طرف اشارے کرتے ہوئے معظم سے پوچھنے لگی۔ "میں سونے ہی لگا تھا۔ تمہاری کھانسی کی وجہ سے ڈسٹرب ہو گیا۔" معظم نے منہ پھلا کر جواب دیا اور پھر واقعی یوں آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گیا جیسے شدید نیند آ رہی ہو۔ معظم کے اس انداز پر وہ تھوڑا سا حیران ہوئی۔ باوجود اس سے کوئی خاص انسیت نہ رکھنے کے معظم ہمیشہ اس کے ساتھ بہت مروت سے پیش آتا تھا۔ آج کی یہ بے مروتی ظاہر کر رہی تھی کہ واقعی وہ بہت تھکا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے بے آرام ہوا تھا۔ وہ چپکے سے بستر سے اتر کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب وہ معظم کی نیند خراب ہونے کے خدشے سے بے نیاز ہو کر آرام سے کھانس سکتی تھی۔ یہاں اسے کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دینے والا بھی نہیں تھا۔ خود معظم کے بارے میں وہ جانتی تھی کہ اپنی بے تحاشا مصروفیت میں اسے آنے والی کل میں یہ بات یاد بھی نہیں رہے گی۔

☆☆☆

"ناجیہ! اچھی سی چائے بنا لے، چھوٹے شاہ صاحب آئے ہیں میرے ساتھ اور ہاں دیکھ اظہر کو بھیج کر کر مو چاچا کی دکان سے بسکٹ بھی منگوا لے۔ کبھی کبھار تو گھر میں قدم رکھتے ہیں وہ۔ خالی چائے پلانا بھلا کیا اچھا لگے گا۔" آج شمس علی کے ہاتھ میں بہت تکلیف تھی تکلیف کی شدت سے بخار بھی چڑھ گیا تھا اسی وجہ سے وہ حسینہ کی واپسی کے اوقات میں حسبِ معمول کھڑکی میں کھڑا ہو کر نگرانی کا فرض انجام نہیں دے سکا تھا لیکن اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑا تھا۔ اسے چارپائی پر لیٹے لیٹے ہی علم ہو گیا تھا کہ حسینہ آج پھر ٹھیکیدار کے بیٹے کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر واپس آئی ہے اور صرف اس کے ساتھ آئی ہی نہیں ہے بلکہ اسے گھر کے اندر تک بھی لے آئی ہے۔ ٹھیکیدار کا بیٹا جسے سب چھوٹے شاہ صاحب کہ کر پکارا کرتے تھے، ان کے گھر کے اندر تھا تو حسینہ کو شمس علی کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ وہ اس سے بے نیاز اس کے سرہانے بیٹھی ناجیہ کو ہدایات کے ساتھ پلو میں بندھے روپے تھما کر واپس اس کمرے میں چلی گئی تھی۔ جہاں چھوٹے شاہ صاحب بیٹھے تھے۔ ناجیہ نے بھی شمس علی کا سر دبانا ترک کر کے فوری طور پر حسینہ کی ہدایات پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ کھڑکی میں سے گلی میں کھیلتے اظہر کو آواز دے کر بسکٹ لانے کی ذمے داری سونپ کر وہ خود پھرتی سے باورچی خانے میں جا گھسی تھی۔ شمس علی اس صورتِ حال پر بری طرح کڑھ رہا تھا۔ بیوی نے خود تو حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی اوپر سے خدمت کرنے والی بیٹی کو بھی اس کے پاس سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ ہاتھ کی تکلیف، بخار کی کھولن اور غیرت پر لگنے والی ضرب کی اذیت سے نڈھال شمس علی کچھ دیر تو بستر پر بے بس سا پڑا رہا پھر ہمت کر کے اٹھا اور دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کے قریب جا کر اسے ذرا سا وا کرتے ہوئے کمرے میں جھانکا۔ ٹھیکیدار کا بیٹا کمرے میں موجود کل دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا۔ حسینہ بھی دوسری کرسی پر اس کے قریب ہی بیٹھی تھی جبکہ ناجیہ جھجکی آنکھوں سے ان دونوں کو چائے پیش کر رہی تھی۔ شمس علی کو اپنی بیٹی کا اس طرح چھوٹے شاہ صاحب کی خدمت کرنا اچھا نہ لگا۔ ادھر حسینہ اس کے جذبات سے بے خبر لہجے میں حلاوت گھولے بڑے فدویانہ انداز میں چھوٹے شاہ صاحب سے کہہ رہی تھی۔

"چائے پیجیے چھوٹے شاہ صاحب! میری ناجیہ نے خاص طور پر آپ کے لیے بڑی محنت سے بنائی ہے۔ بڑی سلیقے والی اور فرمانبردار بچی ہے یہ۔ میری ہر بات مانتی ہے۔"

ناجیہ اپنی اس تعریف پر شرما کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"تمہاری بات ماننے سے تو شاید ہی کوئی انکار کرتا ہو حسینہ بی! میں نے خود کتنوں کو دیکھا ہے جو تمہارے ایک

اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ اصل بات تو تب ہے جب کوئی تم سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جائے۔" چھوٹے شاہ صاحب نے حسینہ کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔ پھر ذرا معنی خیز انداز میں بولی۔

"ماننے والی بات میں بھی مان لینے کو تیار رہوں۔ آپ کو یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لیں۔"

"آزمانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میں تو اب تک صرف اس لیے صبر سے بیٹھا ہوں کہ بات کو طریقے سے وقت پر کہنے کا قائل ہوں۔ مناسب وقت آیا تو پھر ذرا دیر نہیں لگاؤں گا اپنی بات کہنے میں اور تمہیں بھی میری بات ماننی ہی پڑے گی۔" چھوٹے شاہ صاحب کا لہجہ بھی معنی خیز تھا۔

"زہے نصیب۔" حسینہ نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ کواڑ پکڑ کر کھڑے شمس علی کو مزید ان کی باتیں سننے کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ واپس اپنی چارپائی پر آلیٹا۔ اس ذرا سی مشقت کے ساتھ جذبات میں امڈنے والے جوار بھاٹے نے مل کر اسے ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چارپائی پر پڑا وہ دوسرے کمرے سے آتی آوازوں کو، جن میں حسینہ اور چھوٹے شاہ صاحب کی مدھم ہنسی بھی شامل ہو جاتی تھی، خود پر جبر کیے سنتا رہا۔ چھوٹا شاہ صاحب وہاں شاید پندرہ منٹ ہی بیٹھا ہو گا لیکن شمس علی کے لیے یہ پندرہ منٹ گزارنا بھی صدیوں کے انتظار کے برابر تھا۔

"آج تو تھک گئی بری طرح۔ بڑے صاحب کا آرڈر آ گیا تھا کہ لاٹ آج ہی مکمل کرنی ہے۔ کام میں دوپہر کی روٹی کھانے کا بھی وقت نہیں ملا۔" چھوٹے شاہ صاحب کے جانے کے بعد حسینہ اپنی لمبی چوٹی کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور چارپائی پر بیٹھ کر خود ہی اپنی ٹانگیں دبانے لگی۔ کچھ دیر قبل لہجے سے پھوٹنے والی شگفتگی کی جگہ اب اس کا پورا وجود شدید تھکن کا مظہر محسوس ہو رہا تھا۔ شمس علی کلس کر اسے دیکھنے لگا اس دیکھنے کے عمل میں اسے ایک بار پھر اعتراف کرنا پڑا کہ حسینہ غضب کی شے ہے جو کسی بھی بڑے سے بڑے زاہد کے ایمان کو ڈگمگا سکتی ہے۔ شمس علی کے حکم پر ساڑھی ترک کر کے شلوار قمیص پہننا شروع کرنے کے باوجود اس کے وجود کی رعنائیوں پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اب بھی "حسینہ" ہی تھی اور یہ بات شمس علی کا چین لوٹنے کے لیے کافی تھی۔

"کمال ہے کہ لوگ تجھ سے بھی کام کرواتے ہیں۔ تو چاہے تو لوگ خود تیری غلامی کرنے لگیں۔"

جلا بھنا شمس علی خود کو طنز کرنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔

"مطلب کیا ہے اس بات کا؟" حسینہ فوراً ہی چونکی اور چمک کر پوچھنے لگی۔

"مطلب مجھ سے کیا پوچھتی ہے؟ چھوٹے شاہ کو تو تو نے اپنا ڈریور (ڈرائیور) بنا رکھا ہے تو پھر اور کون ہے وہاں جو تجھ سے کام لیتا ہو۔" شمس علی بھی زیادہ مروت کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے بنا لحاظ کے جتا گیا۔

"ادھر کام چھوٹے شاہ صاحب نہیں اس کے باپ کی مرضی سے ہوتا ہے اور چھوٹا شاہ صاحب بھی اگر کبھی مجھے گھر چھوڑ جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا ڈریور بن گیا ہے۔ وہ تو اس کا اپنا مطلب ہے جو وہ مجھ پر یہ مہربانی کر دیتا ہے۔" حسینہ نے شمس علی کی بات کا جواب دیا۔

"یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا مطلب ہے اس کا تجھ سے؟ کیوں وہ تیری چاکری کرتا ہے؟"

شمس علی اب چارپائی پر اٹھ بیٹھا تھا اور غصے سے کپکپاتا حسینہ سے پوچھ رہا تھا۔

"وقت آنے پر تجھے بھی سارے مطلب پتا چل جائیں گے۔" حسینہ کا موڈ شمس علی کے انداز پر خراب ہو گیا تھا چنانچہ وہ بھی کچھ غصے سے بولی۔

"وقت کے انتظار میں میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ لوگ جانے کیسی کیسی باتیں بناتے ہوں گے تجھے اس کی گاڑی میں آتے دیکھ کر۔ انہیں تو یہی خیال آتا ہو گا کہ شمس علی ذرا سا معذور کیا ہوا اس کی عورت بالکل ہی آزاد ہو گئی۔" شمس علی کے اندر کئی دنوں سے پکتا لاوا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔

"لوگوں کی باتیں نہ کیا کرو میرے سامنے۔ اس وقت کہاں تھے یہ لوگ جب تمہارا ہاتھ کٹا؟ کیسے میں تنہا عورت ہر طرف بھاگتی پھرتی تھی؟ اس وقت تو کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا اور جب گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگی تھی تب کہاں تھے یہ لوگ؟ اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں میں ایسے لوگوں کو۔ مجھے نہیں پروا ان لوگوں کی۔ میں تو وہ کروں گی جو مجھے اپنے اور اپنے بچوں کے حق میں اچھا لگے گا۔" حسینہ اپنے مزاج کے برخلاف بری طرح بھڑک اٹھی اور شمس علی کو دو بدو جواب دے کر جھٹکے سے چارپائی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

شمس علی آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ حسینہ اتنی دیدہ دلیر ہو گئی ہے کہ اسے بھی خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔ شاید اس کی یہ دیدہ دلیری شمس علی کی معذوری اور اپنی خود مختاری کے باعث تھی۔ یہ حسینہ کی اس

دیدہ دلیری اور اپنی بے بسی کے تجزیے میں الجھے شمس علی کو احساس نہ ہوسکا کہ کتنے لمحے گزر چکے ہیں۔ وہ کمرے میں ابھرتے والی آہٹ پر اپنے خیالوں سے نکلا تو دیکھا حسینہ کچھ نادم نادم سی سامنے کھڑی تھی۔

''ناجیہ بتارہی تھی کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔ ہاتھ میں صبح سے درد ہورہا ہے اور بخار بھی چڑھ گیا ہے۔'' اب اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔ شمس علی نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر منہ پھیر لیا۔

''غلطی ہوگئی مجھ سے۔ بیکار میں غصے میں آگئی۔ کیا کروں دن بھر کی محنت اور لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں سے طبیعت بیزار ہوجاتی ہے اس پر گھر آکر بھی کچھ سننا پڑے تو متھا بالکل ہی گھوم جاتا ہے۔'' وہ اپنے رویے کی وضاحت پیش کررہی تھی۔ شمس علی نے اس بار بھی کوئی جواب دینے کی زحمت نہ کی۔

''اچھا ٹھیک ہے مت بولو مجھ سے لیکن میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس تو چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تکلیف اور بڑھ جائے۔'' شمس علی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتی اب وہ وہی حسینہ تھی جو بڑے پیار سے شمس علی کے ناز اٹھاتی تھی۔

''کہیں نہیں جانا مجھے۔ پڑا رہنے دے یہیں۔ اچھا ہے ایک دن جان سے ہی چلا جاؤں تو پھر کوئی تجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں رہے گا۔'' شمس علی حسبِ معمول پگھلنے لگا تھا لیکن اوپری طور پر غصہ دکھا رہا تھا۔

''اچھا بابا! میری توبہ جو آئندہ کبھی چھوٹے شاہ صاحب کے ساتھ گاڑی میں آئی۔ اب تو تم غصہ چھوڑ دو اور میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔'' حسینہ نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے وعدہ کیا تو شمس علی مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ اس کے مان جانے کی علامت تھی۔ ''بس ہمیشہ نخرے ہی دکھاتے رہا کرو۔ جیسے مجھے تو تمہارے نخرے اٹھانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔'' اسے مسکراتے دیکھ کر حسینہ بڑبڑانے لگی۔ اس بار اس کی یہ بڑبڑاہٹ شمس علی کو بری نہیں لگی۔ وہ کچھ دیر قبل ہونے والی تلخی کو فراموش کرکے حسینہ کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتا رہا۔

٭٭٭

ریوالونگ چیئر پر بیٹھا معظم شیشے کے اس پار نظر آنے والی کنول پر نظریں جمائے بہت انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ان پرشوق نظروں میں ایک خاص طرح کی نرمی تھی۔ وہ نرمی جو دل میں دوسرے فریق کے لیے موجود احترام کی صورت میں ہی نظروں سے جھلکتی ہے۔ معظم جرأت سے کام لیتے ہوئے خود سے اعتراف کرتا تو بات بہت واضح تھی وہ کنول کو محبت بھری نظروں سے تک رہا تھا۔ لیکن یہ اعتراف کرنا ہی تو آسان نہیں تھا۔ کیسے وہ اپنے اور اس کے درمیان دو عشروں سے بھی زیادہ طویل عمر کے فرق کو نظر انداز کردیتا۔ پر اس کے تسلیم نہ کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ جو وہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا وہ اس کی بے اختیاری خود تسلیم کرواتی جارہی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت کنول کا اس کے آفس کے ساتھ والے کیبن میں موجود ہونا تھا۔ اپنے فیصلے کے مطابق وہ کنول کو اپنی سیکریٹری کی حیثیت سے ہٹ کر فیکٹری میں کوئی جاب آفر نہیں کرسکا تھا اور کنول نے اس کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام شروع کردیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی ٹریننگ جاری تھی۔ اس وقت بھی معظم دیکھ رہا تھا کہ منیجر افتخار کنول کے کیبن میں موجود ہے اور کنول کو کچھ سمجھا رہا ہے۔ کنول تھوڑی کے نیچے اپنا بال پوائنٹ رکھے اس کی بات غور سے سن رہی تھی۔ معظم نے نوٹ کیا تھا کہ کسی بات کو توجہ سے سمجھنے کے لیے یہ کنول کا مخصوص انداز تھا اور سچ یہ تھا کہ اس پر یہ انداز خوب سجتا بھی تھا۔ کنول کے اس انداز کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے معظم کو قطعی فکر نہیں تھی کہ کنول کے کیبن میں موجود منیجر اس کی یہ حرکت دیکھ سکتا ہے۔ دراصل معظم کے آفس اور کنول کے کیبن کے درمیان موجود گلاس وال کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ معظم تو کنول کی تمام حرکات وسکنات دیکھ سکتا تھا لیکن کنول کے کیبن سے معظم کے آفس کا منظر دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ اس سہولت کا فائدہ اٹھا کر معظم آرام سے اپنے شوق کی تسکین کرتا رہتا تھا لیکن پھر اس عمل کے دوران ہی اس پر اچانک احساسِ ندامت طاری ہوجاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ دل میں ابھرنے والے احساسِ ندامت نے اسے ریوالونگ چیئر کا رخ موڑ کر کنول پر سے نظریں ہٹانے پر مجبور کردیا۔

''تم نہایت غلیظ آدمی ہو۔ شادی شدہ زندگی کے بیس سال گزارنے کے بعد تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ایک ان چھوئی کلیوں جیسی لڑکی کے لیے اس انداز میں سوچو؟ جانتے بھی ہو کہ خود تمہاری اپنی بیٹی چودہ برس کی ہوچکی ہے۔ یہ لڑکی جس کا نام کنول منیر ہے اور جس کے حلیے سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہوکر تمہارے آفس تک آئی ہے، تمہاری بیٹی سے چار پانچ برس ہی بڑی ہوگی۔ اگر تم شادی کے پہلے برس ہی باپ بن جاتے تو تمہاری بیٹی اور یہ لڑکی بالکل ہم عمر ہوتیں۔ اپنی بیٹی کی عمر کی کسی لڑکی کو اس انداز میں دیکھنا اور اس کی خواہش پالنا گھٹیا پن کے سوا کچھ نہیں۔''

کنول کی طرف سے رخ موڑنے کے بعد جب معظم نے خود کو لعن طعن کرنے کا وہ سلسلہ بھی شروع کر دیا جس کے سہارے وہ اتنے دنوں سے کنول کے لیے اپنے دل میں ابھرنے والے جذبوں پر بند باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ بند جذبوں کی شورش کے آگے کتنے عرصے ٹھہرا رہتا۔ معظم اس وقت سے خوفزدہ تھا جب اس بند میں شگاف پڑتا اور اس کے دل میں موجود جذبے سیل رواں کی طرح بہ نکلتے۔ وہ ہر حال میں اس سیل رواں کو روکنا چاہتا تھا کہ بیس سال پہلے بھی بہت سی بدنامی اور رسوائی کو سہ چکا تھا۔ بیس سال پہلے جوانی کے جوش میں اس نے بہت ہی خراب صورت حال کا مقابلہ پوری طرح ڈٹ کر کرلیا تھا لیکن اب...... اب جانے وہ اس بوجھ کو اٹھانے کا متحمل ہو بھی پاتا یا نہیں؟

☆☆☆

معظم کے اندازے کے برخلاف کنول اس کی نظروں کی چوری سے واقف تھی۔ اول روز ہی اس نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ کوئی اسے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ وہ ''کوئی'' کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ شیشے کی دیواروں والے اس کیبن میں بیٹھ کر وہ ہر ایک کی ہی نظروں کی رسائی میں تھی۔ اول اول اس نے کوشش کی کہ اس بات کو نظر انداز کردے لیکن نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ مسلسل دیکھے جانے کا احساس اس کے کام میں بھی حارج ہوتا تھا۔ چنانچہ کنول نے نظروں سے نقب لگانے کی کوشش کرنے والے اس چور کو پکڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بہ ظاہر کام میں منہمک رہتے ہوئے وقفے وقفے سے دزدیدہ نظروں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیتی رہتی۔ دو چار دنوں میں ہی اس پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہاں کام کرنے والے اسٹاف ممبر میں سے کوئی بھی بطور خاص اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ ان میں سے کوئی کنول کی طرف دیکھتا بھی تو اچٹتی ہوئی، عام سی نظروں سے جبکہ کنول کے اندر ابھرنے والا احساس اسے بتاتا تھا کہ دیکھنے والا اسے مسلسل دیکھتا ہے۔

بالآخر کنول کا دھیان اپنے ساتھ موجود معظم کے آفس کی طرف گیا اور وہ دھک سے رہ گئی۔ واقعی اسے یہ خیال تو سب سے پہلے آنا چاہیے تھا۔ معظم تو وہ شخص تھا جو پہلی ملاقات کے دوران بھی اسے مسلسل گھورتا رہا تھا۔ کنول کا دھیان نہ جانے کی وجہ شاید یہ تھی کہ خود اس کے اپنے کیبن سے معظم کا آفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ نظر نہیں آتا تھا تو کنول نے بھی نہیں سوچا کہ اسے یوں دیکھنے والا معظم ہوسکتا ہے۔ دھیان آنے پر اس نے اس معاملے پر مزید غور و خوض شروع کردیا اور بات آہستہ آہستہ واضح ہوتی چلی گئی۔ کنول کے اندر خود کو دیکھے جانے کا احساس صرف اسی وقت ابھرتا تھا جب معظم اپنے آفس میں موجود ہوتا۔ اس کی غیر موجودگی میں کنول نے کبھی اس چیز کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں اسے اپنی چھٹی حس پر ذرا بھی شبہ نہیں تھا۔ وہ تو اب یہ بھی بتا سکتی تھی کہ اپنے آفس میں موجودگی کے دوران بھی معظم کب اسے دیکھ رہا ہوتا تھا اور کب نہیں۔ کمال کی بات یہ تھی کہ اسے معظم کا خود کو یوں دیکھنا کبھی برا بھی نہیں لگا تھا۔ وہ اس کی اس حرکت پر کبھی ناگواری محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا جب معظم سے آمنا سامنا ہوتا تو اس وقت وہ معظم کی نظروں کے انداز کو پرکھنے کی کوشش کیا کرتی۔ تجربہ کار نہ ہونے کے باوجود اسے اپنی پرکھ کے نتائج پر اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ معظم کی اس پر اٹھنے والی نگاہوں میں آلودگی کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے دیکھتا ضرور تھا لیکن اس دیکھنے کے پیچھے کسی سفلی جذبے کے بجائے نرم و ملائم، ہلکی ہلکی آنچ دیتے نہایت خوبصورت جذبے کارفرما ہوتے تھے۔ معظم کے ان جذبوں کی آنچ کنول تک پہنچنے لگی تھی۔ وہ اپنے اندر ایک بے نام سی خوشگوار تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ اس تبدیلی کو اس نے بہت خاموشی سے قبول کرلیا تھا۔ نہ وہ معظم کی طرح اپنے آپ سے لڑ رہی تھی اور نہ ہی حیثیت و عمر کے فرق کو بنیاد بنا کر خود کو لعن طعن کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے تو یہ احساس ہی کافی تھا کہ اس کی ذات معظم کے جذبوں کا مرکز ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار چاہے جانے کے تجربے سے گزر رہی تھی اور چاہنے والا بھی وہ تھا جس کی ذات میں کنول کو کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ خوبصورت، مہذب، صاحب امارت، مہربان و بااخلاق معظم میں کم از کم کنول کو کوئی کمی نظر نہیں آئی تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ بے شک اس سے بہت بڑا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ معظم اپنی اصل عمر سے کہیں کم نظر آتا تھا۔ عمر کے جو اثرات اس پر ظاہر تھے ان کی اثر انگیزی بھی بڑی مثبت تھی۔ وہ باوقار، سنجیدہ اور پرکشش دکھائی دیتا تھا۔ ایسے میں کنول کو اس کی ذات میں کوئی کمی کیونکر نظر آتی؟

☆☆☆

شمس علی قدرے پرسکون ہوچلا تھا۔ اس کے منع کرنے کے بعد حسینہ دوبارہ چھوٹے شاہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر واپس نہیں آئی تھی۔ اس کی اس فرمانبرداری نے شمس علی کو خوش کردیا تھا۔ خوشی کے باعث اس کا موڈ بہت

اچھا رہنے لگا تھا۔ مزاج کی یہ تبدیلی طبیعت کے لیے بھی بہت ثابت ہوئی تھی۔ نہ تو اتنے دنوں سے اس کے ہاتھ میں درد اٹھا تھا اور نہ ہی کسی اور قسم کی شکایت پیدا ہوئی تھی۔ گھر کا ماحول اچھا خاصا خوشگوار ہوگیا تھا۔ بچے جو شمس علی کو بے آرامی سے بچانے کے لیے حسینہ کی ہدایت پر بہت احتیاط سے کام لیتے تھے کھلے کھلے سے محسوس ہونے لگے تھے۔ اب ان کی ہنسنے کھیلنے کی آوازوں پر نہ تو شمس علی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا تھا اور نہ ہی حسینہ اور ناجیہ ٹوکتی تھیں۔ گھر کی فضا معمول پر آگئی تھی۔ شمس علی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق بھی کرنے لگا تھا۔ کل ہی کی بات تھی جب حسینہ ان لوگوں کے لیے بازار سے کچھ خریداری کرکے لائی تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی چنانچہ اسی اعتبار سے اس نے سب کے لیے چیزیں لی تھیں۔ دونوں بیٹوں کے لیے سوئٹر، شمس علی کے لیے مفلر اور گرم جرابیں، ناجیہ کے لیے شال اور جوڑا اور خود اپنے لیے بھی ایک شال لے کر آئی تھی وہ۔ تمام چیزیں بڑی عمدہ اور خوبصورت تھیں۔ حسینہ کے مطابق اس نے اپنی ایک سہیلی کی مدد سے لنڈا بازار سے بہت چھان پھٹک کر یہ چیزیں خریدی تھیں۔ صرف ناجیہ کا جوڑا ایسا تھا جو لنڈا بازار کے بجائے کسی اور جگہ سے خریدا گیا تھا۔ ناجیہ اپنا جوڑا اور شال دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ خوش تو دونوں بیٹے اور شمس علی بھی تھے۔ شمس علی نے تو بلکہ اتنی عمدہ خریداری کرنے پر حسینہ کو داد بھی دی تھی۔ اس کی لائی ہوئی کوئی بھی چیز تو لنڈا بازار کی نہیں لگ رہی تھی۔ حسینہ شمس علی کی زبان سے اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ وہ دونوں رات کو بچوں کے سونے کے بعد بھی بہت دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ گزشتہ عرصے کی ساری تلخی جیسے یکدم ہی مٹ گئی تھی۔ شمس علی کی حسینہ سے ساری شکایتیں ختم ہوگئی تھیں۔ آج بہت دنوں بعد ایسا تھا کہ وہ حسینہ کی نگرانی کے بجائے اس کی راہ دیکھنے کے لیے بار بار کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا تھا۔ حالانکہ ابھی حسینہ کے واپس آنے میں بہت وقت پڑا تھا مگر دل کی بے چینی ان باتوں کو سمجھتی ہی کہاں ہے؟ ساڑھے تین بجے کے قریب شمس علی نے ایک بار پھر کھڑکی سے گلی میں جھانکا۔ حسینہ تو ظاہر ہے اس بار بھی وہاں نہیں تھی لیکن شمس علی کو اپنا ایک دوست افضل نظر آگیا۔ افضل نے بھی اسے دیکھ لیا اور دور ہی سے پکارا۔

''اور یار شمسو! کیسا ہے تو؟ طبیعت تو ٹھیک چل رہی ہے تیری؟''

''اللہ کا کرم ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ آ اندر آجا بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' شمس علی نے افضل کو پیشکش کی۔ حسینہ کے انتظار کا ایک ڈیڑھ گھنٹا افضل سے گپ شپ لگانے میں آسانی سے گزر سکتا تھا۔ افضل بھی یقیناً فارغ تھا اس لیے فوراً ہی شمس علی کی پیشکش قبول کرتے ہوئے اندر آگیا۔

''اور سنا کیا حال چال ہے؟ گھر کے معاملات تو ٹھیک چل رہے ہیں؟'' شمس علی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے افضل نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''بس مولیٰ کا کرم ہے۔'' شمس علی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر قدرے افسردگی سے بولا۔ ''میں تو اس حادثے کے بعد سے تقریباً ناکارہ ہوگیا ہوں۔ کہنے کو صرف ایک ہاتھ کٹا ہے لیکن آئے دن کی تکلیف اور دوسری چھوٹی موٹی بیماریوں کی وجہ سے کوئی بھی محنت کا کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ یہ تو تیری بھابی کی ہمت ہے کہ وہ مردوں کی طرح گھر چلانے کے لیے محنت کرتی ہے۔ کمانے کے ساتھ باہر کے کئی دوسرے کام بھی اس بیچاری کے سر پر پڑ گئے ہیں۔'' حسینہ کی طرف سے کل ہی ہونے والے تجدید محبت کے باعث شمس علی بہت کھل کر اس کی خدمات کا اعتراف کر رہا تھا۔

''بس یار! یہ بھی سارے قسمت کے کھیل ہیں۔ مرد کی معذوری عورت کو چار دیواری سے باہر آنے پر مجبور کردیتی ہے۔ کل دیکھا تھا میں نے تیری گھر والی کو بازار میں ایک لڑکے کے ساتھ۔ شاید گھر کے لیے ہی سامان خرید رہی ہوگی۔'' افضل کی بات شمس علی کو بچھو کے ڈنک کی طرح لگی۔ حسینہ نے تو کہا تھا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بازار گئی تھی اور افضل اس کے کسی لڑکے کے ساتھ دکھائی دینے کا ذکر کر رہا تھا۔

''حسینہ کس لڑکے کے ساتھ بازار گئی تھی؟'' اندر کی سوچ بے خیالی میں ہی اس کے ہونٹوں پر آواز بن کر ابھری۔

''تھا ایک لمبا سا، گورا سا لڑکا۔'' افضل نے اس کی بات کے جواب میں بتایا۔ پھر اچانک ہی کچھ یاد آجانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''ارے وہی لڑکا نا، جس کے ساتھ اس کی موٹر میں بھی کبھی کبھی بھابی گھر آتی ہے۔'' افضل کے ان الفاظ نے شمس علی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ افضل سے ملنے والی اطلاع کا مطلب تھا کہ حسینہ نے صرف ظاہری طور پر اسے دکھانے کے لیے چھوٹے شاہ کے ساتھ آنا جانا چھوڑا تھا ورنہ اس کی بے خبری میں وہ اب بھی اس کے ساتھ سیر سپاٹے کرتی پھر رہی تھی۔

''اچھا یار! اب میں چلتا ہوں۔ بڑی دیر ہوگئی۔'' افضل جس کی آمد کا اصل مقصد ہی شمس علی کو یہ اطلاع دینا تھا، شمس علی کے چہرے پر چھائی ہوئی سرخی کو دیکھتا ہوا حجرے

سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شمس علی نے بھی اسے مزید رکنے کو نہیں کہا۔ وہ تو صرف یہ سوچ سوچ کر ہی کھولے جا رہا تھا کہ اگر اس نے اتفاقاً افضل کو آواز دے کر اندر نہ بلایا ہوتا تو اسے اتنی اہم اطلاع نہ ملتی۔ اپنی طرف سے حسینہ تو اسے جل دے ہی گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ افضل اس کے پکارے بغیر بھی اس کے پاس ضرور آتا۔ حسینہ پر وار کرنے کا اتنا اہم موقع وہ آخر کیسے جانے دیتا؟

☆☆☆

معظم حسب معمول شیشے کی دیوار کے اس پار نظر آنے والی کنول کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فون کا ریسیور کان سے لگائے کسی سے بات کر رہی تھی۔ پھر اس کی انگلیوں کی جنبش نے معظم کو بتایا کہ وہ آنے والی کال اسے ٹرانسفر کر رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے اس کی ٹیبل پر رکھا ہوا فون بج اٹھا۔ معظم نے ریسیور اٹھایا۔

''سر! مسٹر قریشی آپ سے بات کریں گے۔'' کنول کی مدھر آواز معظم کے کان میں گونجی۔ پھر قریشی صاحب لائن پر آ گئے۔ قریشی صاحب اس کی گارمنٹ فیکٹری کو کپڑا اسپلائی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کپڑے کی سپلائی سے متعلق ہی کوئی بات کرنے کے لیے معظم کو فون کیا تھا۔ ان سے بات کرنے کے دوران بھی معظم کنول کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے ایک بار پھر وہ احساس ہوا جو آج کنول پر پہلی نظر پڑتے ہی ہوا تھا۔ کنول کچھ بجھی ہوئی اور پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اس کی اس کیفیت پر معظم خود اپنے اندر اضطراب محسوس کرنے لگا۔ اپنے اندرونی اضطراب کے باعث اس نے قریشی صاحب کے فون بند کرتے ہی کنول کو انٹرکام پر اپنے آفس میں آنے کی ہدایت دی۔ کنول فوراً حاضر ہو گئی۔ مگر اب معظم سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا کہے۔ براہ راست یہ پوچھنا کہ آج تم پریشان کیوں نظر آ رہی ہو! خود اسے مشکوک بنا دیتا۔ اس کے اس سوال پر لازماً کنول کے دل میں یہ خیال آتا کہ معظم اپنے آفس میں بیٹھا اس کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ معظم اپنی اس چوری کو کنول کے علم میں نہیں لانا چاہتا تھا چنانچہ اسے اپنے آفس میں کال کرنے کا ایک معقول سبب ڈھونڈ نکالا اور کاروباری نوعیت کا ایک لیٹر ڈکٹیٹ کروانے لگا۔ کنول اس کے سامنے بیٹھی خاموشی سے ڈکٹیشن لیتی رہی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ پریشان ہے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے مس کنول؟'' بالآخر معظم اس سے پوچھ بیٹھا۔

''یس سر!'' کنول نے تیزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ معظم کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ اس سے کسی اور زاویے سے بھی احوال جاننے کی کوشش کرے گا تو وہ اپنا مسئلہ اسے بتانے سے گریز کرے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں مزید کوئی سوال کیے بغیر معظم نے ڈکٹیشن مکمل کروا کر اسے لیٹر ٹائپ کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے اپنے آفس سے جانے کی اجازت دے دی۔ اب وہ خود کنول کے مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا بات بالکل سامنے کی تھی۔ کنول جیسی ضرورتاً گھر سے نکل کر نوکری کرنے والی لڑکی کی پریشانی کا مسئلہ معاشی نوعیت کے ہونے کا امکان سب سے زیادہ تھا۔ معظم نے اپنے سامنے موجود ٹیبل کلینڈر پر نظر ڈالی۔ آج پچیس تاریخ تھی۔ معظم کی فیکٹری میں ورکرز کی تنخواہیں دو تاریخ کو دی جاتی تھیں۔ یعنی فیکٹری قوانین کے مطابق کنول کو تنخواہ ملنے میں ابھی پورا ایک ہفتہ باقی تھا۔ اگر معظم کے یقین کے مطابق کنول کی پریشانی معاشی نوعیت کی ہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ یہ پورا ہفتہ پریشانی میں گزارے گی۔ معظم کو کنول کی پریشانی گوارا نہیں تھی۔ اس نے انٹرکام پر کنول کو فیکٹری کے اکاؤنٹینٹ کو اپنے آفس میں بھیجنے کی ہدایت دی۔ اکاؤنٹینٹ کے حاضر ہوتے ہی اگلے لمحے وہ اسے کنول کی سیلری آج ہی ادا کرنے کی ہدایت دے رہا تھا۔

☆☆☆

اکاؤنٹینٹ سے سیلری کا لفافہ وصول کرتے ہوئے کنول دم بخود رہ گئی۔ حقیقت یہی تھی کہ اسے رقم کی شدید ضرورت تھی۔ امی نے دن رات محنت کر کے ایک بیگم صاحبہ کی طرف سے ملنے والا سلائی کا کام ہنگامی بنیادوں پر مکمل کیا تھا کہ سلائی کی رقم ہاتھ آ جائے تو کنول کی تنخواہ ملنے تک گھر کا خرچ سہولت سے چل جائے لیکن ہوا یہ تھا کہ بیگم صاحبہ کا ڈرائیور سلے ہوئے کپڑے تو وصول کر کے لے گیا تھا پر انہوں نے ڈرائیور کے ہاتھ سلائی کی اجرت نہیں بھجوائی تھی۔ امی نے ڈرائیور سے بیگم صاحبہ کو کہلوایا تھا کہ وہ انہیں اجرت بھجوا دیں لیکن دو دن گزرنے کے بعد بھی ان کی طرف سے رقم نہیں آئی تھی۔ کنول کو معلوم تھا کہ اب یہ رقم اسی وقت آئے گی جب بیگم صاحبہ اپنے مزید کپڑے سلنے کے لیے دینے ان کے گھر آئیں گی۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی کنجوس عورت تھیں۔ کپڑوں کی سلائی کے عوض ان کی طرف سے ہمیشہ مناسب اجرت ہی ملا کرتی تھی لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ رقم جو ان کے نزدیک معمولی تھی، اس کی بروقت ادائیگی کی کنول کے خاندان کے لیے کیا اہمیت ہے۔ امی وہ بھی ان کی اس کوتاہی پر کبھی شکوہ نہیں کیا کرتی تھیں کہ ان کا

عموی خریدار گرد کے گھروں کی سلائی کر کے نکل آتا تھا۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے ملنے والی رقم کو وہ عموماً کسی ایسی مد میں خرچ کرتی تھیں جس کا تعلق روزمرہ کے اخراجات سے ہٹ کر بچوں کی فیسوں، کپڑوں وغیرہ سے ہوتا۔ مگر آج کل طبیعت کی خرابی کے باعث وہ زیادہ سلائی کا کام نہیں کر پا رہی تھیں اس لیے آس پاس کے گھروں کی سلائی کا کام موقوف کر کے بیگم صاحبہ کے کپڑے ترجیحی بنیاد پر یہ سوچ کر سی ڈالے تھے کہ سب سے اچھا کسٹمر ہاتھ سے نہ نکلنے پائے اور یکمشت مناسب رقم ہاتھ آ جائے لیکن بیگم صاحبہ نے ڈرائیور سے کہلوانے کے باوجود اپنے سابقہ بے پروا انداز کو برقرار رکھا تھا۔ شاید کنول کے گھر کا رکھ رکھاؤ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ لوگ کسی قسم کی مالی دشواریوں کا شکار ہیں۔ پھر اتفاق سے امی نے انہیں یہ بھی بتا رکھا تھا کہ ان کا ایک بھائی دبئی میں ہے اور کبھی کبھار انہیں وہاں سے رقم بھیج دیتا ہے۔ یقیناً اس کبھی کبھار کو مستقل خیال کرتے ہوئے بیگم صاحبہ ان لوگوں کو اچھا خاصا آسودہ حال سمجھتی تھیں اس لیے بھی بے پروائی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ اب اصل بات تو یہ تھی کہ قبر کا حال مردے کا سوا کون جان سکتا ہے۔ یہ تو کنول اور اس کے گھر والوں ہی کو معلوم تھا کہ پرچون کی دکان والے نے پچھلا حساب بے باق نہ ہونے کے سبب مزید سامان ادھار دینے سے صاف انکار کر دیا ہے، بجلی کا بل بھی دو ماہ سے ادا نہ کیے جانے کے سبب اس بار بجلی کٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ کنول کو فیکٹری کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت ملی ہوئی تھی ورنہ شاید فیکٹری تک آنے جانے کا کرایا ادا کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔

گھریلو حالات کے سدھار کے لیے اس کی فیکٹری کی جاب بہت ضروری تھی۔ کنول کو امید تھی کہ فیکٹری سے ملنے والا مناسب مشاہرہ جلد ان کو اس کرائسس سے نکال دے گا اور آج قبل از وقت ہاتھ آ جانے والی سیلری کو پا کر اسے جو سکون محسوس ہوا تھا اس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ اس کی امید بے جا نہیں تھی۔ البتہ کنول کو تھوڑی سی حیرت تھی کہ اسے قبل از وقت تنخواہ کیونکر ادا کر دی گئی مگر پھر ذرا سی سوچ بچار نے اس پر صورت حال واضح کر دی۔ اسے خیال آیا کہ معظم نے جب اسے اپنے کمرے میں ڈکٹیشن کے لیے بلایا تھا تو اس سے اس کی طبیعت پوچھی تھی۔ یقیناً وہ کنول کے چہرے سے اس کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔ اسی لیے اس نے اکاؤنٹینٹ کو اپنے آفس میں بلایا تھا کہ اسے کنول کو تنخواہ دینے کی ہدایت دے سکے۔ معظم کے اس عمل نے کنول کے دل میں اس کی عزت کو بڑھا دیا تھا۔ وہ یقیناً ایک اچھا چہرہ شناس تھا جو بہت زیادہ کرید نہ لگانے کے باوجود اس کی پریشانی کی نوعیت سمجھ گیا تھا اور مہذب طریقے سے پریشانی کا حل بھی پیش کر دیا تھا۔ اگر وہ کوئی بدقماش قسم کا موقع پرست آدمی ہوتا تو کنول کی ضرورت کے اس مقام تک آنے کا انتظار کرتا جب وہ خود اپنے منہ سے اپنی ضرورت بیان کرنے پر مجبور ہو جاتی اور پھر وہ اس پر احسان جتاتے ہوئے اس کی ضرورت اس انداز میں پوری کرتا کہ کنول خود کو زیر بار ہی محسوس کرتی رہتی۔ کم عمری کے باوجود کنول ان ہتھکنڈوں سے ناواقف نہیں تھی جو کنول جیسے حالات رکھنے والی لڑکیوں کو زیر دام لائے جانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر معظم نے کنول میں دلچسپی رکھنے کے باوجود ایسا کوئی ہتھکنڈا استعمال نہیں کیا تھا۔ اس نے تو اشارتاً بھی کنول کو یہ جتانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ اس پر کوئی احسان کر رہا ہے اور اس کے اس انداز نے کنول کے دل میں معظم کی قدر کچھ اور بھی بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

"طبیعت کیسی ہے تمہاری؟" آج بہت دنوں بعد معظم رات کے کھانے پر اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کی تھی تم نے؟" معظم نے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہوتے حلقوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

"اس طرح اپنی صحت کے ساتھ بے پروائی برتنا کوئی اچھی بات نہیں۔ مجھ سے چھپا کر یا جھوٹ بول کر تم میرے ساتھ نہیں اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ کیا میں نہیں سمجھتا کہ آج کل تم نے الگ بیڈ روم میں سونا کیوں شروع کر دیا ہے؟ تم تو شاید یہ سمجھتی ہو کہ میں نے تمہارے بہانے پر یقین کرتے ہوئے یہ بات مان لی ہے کہ میرے دیر تک جاگنے سے تم ڈسٹرب ہوتی ہو اس لیے الگ سونے لگی ہو حالانکہ میرا راتوں کو دیر تک جاگنا کوئی نئی بات نہیں پھر تم خود کون سا بہت جلدی سونے کی عادی ہو؟ میری طرح آپ بھی تو سلیپنگ پلز لیے بغیر نیند نہیں آتی۔" معظم بہت فرصت سے اس کا محاسبہ کر رہا تھا۔

"جب آپ ساری بات سمجھتے ہیں تو پھر مجھ سے کیوں سوال کرتے ہیں؟ تھکتے نہیں ہیں آپ اس روز روز کی مشقت سے؟ ڈاکٹرز، ہاسپٹل، دوائیں۔ ساری زندگی میری وجہ سے آپ نے ان ہی چکروں میں گزاری ہے۔ بس اب جانے دیں اس چکر کو۔ چھوڑ دیں مجھے میرے حال پر۔ آخر کب تک

آپ ان مصنوعی سہاروں کے سہارے نیم مردہ وجود میں زندگی کو ٹھہرائے رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے؟'' معظم جانتا تھا وہ خود ترسی کا شکار ہے۔ زندگی کے دیے زخم اپنی جگہ لیکن ایک سچ یہ بھی تھا کہ اس نے کبھی حالات سے مزاحمت کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر وہ یہ کوشش کرتی تو ان دونوں کی زندگی موجودہ زندگی سے کہیں بہتر ہو سکتی تھی۔ بیٹی کا وجود بھی اسے اس مزاحمت پر مجبور نہیں کر سکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کی ذہنی حالت وقتاً فوقتاً اس درجے پر پہنچ جاتی تھی کہ معظم کے پاس اسے کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل کروانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا تھا۔ بیٹی کو بھی اس نے اسی وجہ سے گھر سے دور مری کانونٹ میں داخل کروا رکھا تھا کہ گھریلو پریشانیاں اور ماں کی حالت اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

''اس انداز میں سوچ کر تم خود غرضی کا مظاہرہ کرتی ہو اور کچھ نہ سہی لیکن تمہیں مومو کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ صرف چودہ سال کی ہے وہ۔ اسے تمہاری، اپنی ماں کی ضرورت ہے۔'' معظم کو اس پر غصہ آرہا تھا لیکن وہ تحمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔

''مومو سے بھی کم عمر بچے ماں کے بغیر رہ لیتے ہیں یہ بات ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر موموں کو تو یوں بھی میری عادت نہیں۔ چھوٹی تھی تو آپا کی گود میں رہی۔ ذرا بڑا ہوتے کے بعد آپ نے اسے ہاسٹل بھیج دیا۔ کبھی کبھار صرف چھٹیوں میں ملنے والی ماں اگر نہ بھی رہی تو اسے کون سا بہت زیادہ فرق پڑ جائے گا۔'' اس کے پاس اپنی ہی دلیلیں تھیں جن سے وہ معظم کو ہمیشہ بے بس کر دیا کرتی تھی۔

''کیوں کرتی ہو تم ایسا؟ زندگی کا ایسا کون سا آرام اور سکھ ہے جو میں نے تمہیں دینے کی کوشش نہیں کی؟'' معظم جو کھانے سے پہلے ہی ہاتھ کھینچ چکا تھا نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا ہوا لاچاری سے بولا۔

''میں نے کب ایسا کہا ہے؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے آپ سے کبھی کوئی شکوہ نہیں رہا۔ میں تو خود ہمیشہ اس احساس جرم میں مبتلا رہی ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو آپ کی زندگی کی خوشیاں نہیں مل سکیں۔ میں بنا خواہش آپ کی زندگی میں داخل ہوئی اور آپ اپنی شرافت کی وجہ سے آج تک اس ناپسندیدہ رشتے کو نبھا رہے ہیں۔ اگر آپ میرے کہنے پر کم از کم دوسری شادی کے لیے ہی راضی ہو جاتے تو میرے دل کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا۔ مگر آپ نے ایسا نہ کر کے میرے احساس جرم کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔'' یہ وہ دیرینہ مطالبہ تھا جو بیس سالہ ساتھ میں وہ بارہا معظم سے کرتی رہی تھی۔ معظم جس کا دل ہی اس شادی کے بعد بجھ کر رہ گیا تھا ہر بار اس مطالبے کو سختی سے رد کر دیتا تھا لیکن آج وہ خاموش رہا۔ بیوی کی بات سن کر اس کا ذہن خود بخود کنول منیر کی طرف چلا گیا تھا۔ کنول کے لیے اس کے دل میں جو جذبہ جاگا تھا وہ اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ اپنی بیوی کی پیشکش سے فائدہ اٹھائے لیکن بہت کچھ تھا جو اسے اپنی اس خواہش پر عمل کرنے سے روک رہا تھا۔

☆☆☆

''ناجیہ! ذرا اپنی اور اپنے بھائیوں کی وہ چیزیں تو لے کر آ جو تیری ماں کل خرید کر لائی تھی۔'' حسینہ گھر واپس پہنچی تو شمس علی کو اپنا لایا ہوا مفلر اور جرابیں سامنے رکھے بیٹھا پایا۔ حسینہ کی آمد پر اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے وہ ان ہی چیزوں پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا تھا۔ حسینہ اس کی اس کیفیت پر مسکرا دی۔ یقیناً بہت دنوں بعد نئی چیزیں وہ بھی اتنی عمدہ معیار کی دیکھ کر شمس علی خوش ہو گیا تھا اور اب بچوں کی طرح انہیں بار بار دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ ناجیہ نے اس کے حکم پر اپنی اور دونوں بھائیوں کی چیزیں لا کر مفلر اور جرابوں کے ساتھ ہی اس کے سامنے رکھ دیں۔ شمس علی ایک منٹ تک ان چیزوں کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنی چارپائی کے نیچے ہاتھ ڈال کر وہاں سے ایک بوتل نکالی۔ اس بوتل میں وہ کچھ دیر قبل ہی دکان سے مٹی کا تیل لے کر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ حسینہ اور بچے کچھ سمجھ پاتے شمس علی نے تمام اشیا نیچے فرش پر ڈھیر کیں اور ان پر مٹی کے تیل کی بوتل الٹ کر ایک جلتی ہوئی ماچس کی تیلی اس ڈھیر پر پھینک دی۔ اونی کپڑوں نے مٹی کے تیل کے ساتھ فوراً ہی آگ پکڑ لی۔

''ابا...'' ناجیہ نے صدمے کی کیفیت میں اس جلتے ہوئے ڈھیر میں سے اپنی شال کھینچنے کی کوشش کی۔

''خبردار! جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ جان سے مار دوں گا۔'' شمس علی بری طرح غرایا۔

ناجیہ نے خوفزدہ ہو کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔ انور اور اظہر بھی سہمے ہوئے کھڑے رہے۔

''یہ کیا کیا تم نے شمس علی؟'' حسینہ جو بالکل گنگ ہو گئی تھی ہوش میں آ کر چلائی۔

''کیوں بہت دکھ ہو رہا ہے؟'' شمس علی نے طنز سے حسینہ سے پوچھا۔

''نہیں ہو گا کیا؟ روپے کوئی پیڑوں پر تو نہیں لگتے۔ کتنی محنت کے بعد ان چیزوں کے لیے میں نے روپے

جوڑے تھے۔'' صدمے سے حسینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''محنت سے روپے جوڑے تھے یا چھوٹے شاہ کی مہربانی کا کمال تھا یہ سارا؟'' شمس علی نے راکھ میں تبدیل ہوتی اشیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں پوچھا۔

''کس نے کہا تم سے کہ یہ چھوٹے شاہ صاحب کی مہربانی ہے؟'' حسینہ چونکی۔

''تو کیا نہیں ہے؟ مجھ سے مکر کرنے کی کوشش مت کرنا۔ افضل نے خود تجھے اس کے ساتھ بازار میں دیکھا تھا۔'' شمس علی پھٹ پڑا۔

''اچھا تو یہ ساری اس افضل کی لگائی ہوئی آگ ہے۔ مردود کے اپنے کرتوت شیطانی ہیں اور دوسروں کی جاسوسیاں کرتا پھرتا ہے۔ اگر میں تمہیں تمہارے اس جگری دوست کی حرکتیں بتادوں تو تم اس کی شکل دیکھنا گوارا نہ کرو۔'' افضل کا نام سن کر حسینہ بھی بھڑک گئی تھی۔

''افضل کی بات چھوڑ اور یہ بتا کہ تجھے یہ چیزیں چھوٹے شاہ نے دلائی تھیں یا نہیں؟''

شمس علی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''اگر دلا بھی دیں تو کیا برا کیا؟ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ غریب بچوں کا اتنا خیال کرتے ہیں ورنہ یہاں جس کے پاس ذرا چار پیسے ہوں تو ہم جیسوں سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتا۔'' حسینہ کے اس جملے میں ڈھکا چھپا اعتراف تھا۔

''مجھے اور میرے بچوں کو چھوٹے شاہ کی ان مہربانیوں کی ضرورت نہیں۔ تیرا دل ان چیزوں کے لیے تڑپتا ہے تو شوق سے وصول کرتی پھر اگر اس کی یہ مہربانیاں۔ بھلا مجھ سا معذور آدمی تجھے تیری مرضی کرنے سے کیسے روک سکتا ہے؟'' شمس علی کا لہجہ پست ہوکر آزردہ سا ہوگیا تو حسینہ کو افسوس ہونے لگا۔ وہ شمس علی کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ وہ خاندان کا سربراہ ہونے کے باوجود خاندان کی کفالت کا فریضہ انجام نہیں دے پارہا تھا اس لیے جھنجلاہٹ اور چڑچڑے پن کا شکار ہوگیا تھا۔

درحقیقت شمس علی کے دل میں کیا خیال پلنے لگا تھا اس کا تو حسینہ اندازہ ہی نہیں لگا سکی تھی۔

☆☆☆

اپنے کیبن میں بیٹھی کنول خود پر جمی معظم کی نظروں کی تپش محسوس کررہی تھی۔ ابتدا میں وہ اپنے اس طرح دیکھے جانے پر کچھ نروس ہوجاتی تھی لیکن اب اسے یہ بات اچھی لگنے لگی تھی۔ دن میں کسی بھی وقت اچانک معظم اس کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا اور کمال یہ تھا کہ وہ اس کا متوجہ ہونا محسوس بھی کرلیتی تھی۔ ان لمحات میں اس کی کوشش ہوتی کہ چہرے سے کسی بھی قسم کے تاثرات کو ظاہر کیے بغیر کام میں منہمک نظر آئے لیکن آج اچانک ہی اسے شرارت سوجھ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ کسی طرح معظم کو جتادے کہ وہ اس کی اس چوری سے واقف ہے۔ ذرا سا سوچنے پر اسے ایک خیال بھی سوجھ گیا۔ بالکل غیر محسوس طور پر اس نے اپنی کرسی کا رخ موڑ کر اس زاویے پر کرلیا کہ معظم کی طرف سے تھوڑی سی آڑ ہوجائے اور وہ اس کے ہاتھوں کی جنبش نہ دیکھ سکے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے اپنی ٹیبل کی دراز سے پیپر کٹر نکالا اور آنکھیں میچتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پر اس سے ایک کٹ لگادیا۔ فوراً ہی انگلی سے خون بہ نکلا۔ کنول ایک جھٹکے سے کرسی واپس موڑتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ اس کی انگلی سے نکلنے والے خون کے قطرے سامنے رکھے لیٹر پیڈ پر گرنے لگے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی انگلی سے بہتا یہ خون معظم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے اس کے یقین پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ معظم بہت تیزی سے گھبرایا ہوا اس کے کیبن میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا کنول! ہاتھ کیسے کٹ گیا؟'' بہت بے ساختگی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر کنول کی انگلی سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اس بات کا بھی دھیان نہیں تھا کہ اسٹاف کے لوگ اس کی یہ حرکت دیکھ رہے ہوں گے۔

''بس سر! ذرا سی بے دھیانی سے پیپر کٹر سے زخم لگ گیا۔ آپ فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' کنول نے ہونٹ دبا کر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے معظم کی بات کا جواب دیا اور بالکل غیر محسوس طور پر اس کا ہاتھ ہٹا کر خود رومال سے اپنا خون روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ ویسے معظم کو آزمانے کے چکر میں کی جانے والی شرارت خود اسے بھی مہنگی پڑی تھی۔ زخم اندازے سے کچھ زیادہ ہی گہرا لگ گیا تھا اور جریان خون کے ساتھ ساتھ تکلیف بھی محسوس ہورہی تھی۔

''افتخار صاحب! ڈاکٹر نصیر کو فرسٹ ایڈ بکس کے ساتھ میرے آفس میں بھیجیں۔''

کنول کے ہاتھ چھڑا لینے پر معظم انٹرکام کی طرف متوجہ ہوا اور کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں ہمہ وقت فیکٹری میں موجود رہنے والے ڈاکٹر کو بھیجنے کی ہدایت دی۔ اس طرف سے فارغ ہوکر وہ کنول کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ

میرے آفس میں چلیے۔'' کنول نے فرمانبرداری سے اس کے حکم کی تعمیل کی اور معظم کے ساتھ اس کے آفس میں چلی گئی۔ ڈاکٹر بھی فوراً حاضر ہو گیا اور کنول کی انگلی سے بہنے والے خون کو روک کر اس پر پٹی باندھ دی۔

''دھیان کہاں تھا آپ کا جو خود کو اتنی گہری چوٹ لگا بیٹھیں۔'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد معظم نے قدرے تیز لہجے میں کنول سے پوچھا۔ کنول کی مدت ملازمت میں یہ پہلا موقع تھا جو معظم اس سے اس لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''سوری سر! اصل میں، میں کچھ نروس ہو گئی تھی۔'' کنول نے نظریں جھکا کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو معظم حیران سا ہو گیا۔

''نروس ہو گئی تھیں...... مگر کس چیز سے؟'' اس کی حیرت سوال بن کر لبوں پر چلی آئی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا سر کہ میری انگلی کٹ گئی ہے؟'' کنول نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر نظریں جھکائے جھکائے ہی اس سے پوچھا۔

''وہ تو میں......'' معظم اس کے سوال کا جواب دیے جا رہا تھا کہ اچانک چپ ہو گیا۔ وہ کنول کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ نروس ہو گئی تھی اور معظم کے پوچھنے پر کہ کس چیز سے نروس ہو گئی؟ بتانے کے بجائے اس سے پوچھ رہی تھی کہ معظم کو اس کی انگلی کٹنے کا کیسے پتا چلا؟ یقیناً وہ جتا رہی تھی کہ وہ معظم کی تاک جھانک سے گھبرا کر اپنی انگلی زخمی کر بیٹھی ہے۔

''سوری۔'' چوری پکڑے جانے کا احساس ہونے پر معظم نے فوراً ہی معذرت طلب کر لی۔

''آپ کو سوری کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے کچھ برا ہی نہیں لگا۔'' کنول کا جواب میں کہا گیا جملہ ایک بار پھر معظم کو چونکا گیا۔ اس نے گہری نظروں سے اپنا سر جھکائے سامنے بیٹھی کنول کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی لیکن پلکیں حیا کے بوجھ سے لرز رہی تھیں یعنی وہ واقف تھی کہ کیا کہہ رہی ہے۔

''تھینک یو ویری مچ کنول۔'' معظم یکدم ہی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ بہت دنوں سے وہ جس کشمکش کا شکار تھا کنول کے ردعمل نے اسے ختم کر دیا تھا۔ البتہ جگ ہنسائی اور رسوائی کا خوف ابھی پوری طرح دل سے نہیں نکلا تھا۔

☆☆☆

بات کھل جانے کے بعد معظم اور کنول نے ایک خودکار سے انداز میں اس تعلق کو قبول کر لیا تھا۔ معظم کو کنول کے رویے پر حیرت ہوتی تھی۔ باوجود کم عمر ہونے کے وہ بہت پختہ سوچ کی حامل تھی۔ اس میں ٹھہراؤ تھا۔ معظم نے اس عمر کی لڑکیوں کو عموماً لاابالی ہی پایا تھا ایسے میں کنول کا انداز اس کے لیے حیران کن تھا۔ معظم کی چوری پکڑ لینے کے بعد اس نے دوبارہ معظم سے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ اس کے انداز میں معظم کے لیے اپنائیت بے شک بڑھ گئی تھی لیکن اس انداز میں معظم سے بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ اس کے احترام میں کمی آتی۔ وہ معظم کی بہت عزت کرتی تھی۔ اس کی خیال داری میں بھی ایک گھریلو عورت کا سا انداز تھا۔ وہ ادائیں اور طرح داری جو اس طرح کی پوسٹ پر کام کرنے والی لڑکیوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں، کنول میں ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار ہونے کے باوجود باوقار تھی۔ معظم سے بات کرتی تو باحیا بے شک محسوس ہوتی لیکن کم اعتماد ہرگز نہیں۔ ابتدا میں اس کے اس انداز پر حیران ہونے والے معظم کو آہستہ آہستہ کنول کی اس پختگی کی وجوہات سمجھ آنے لگیں۔

کنول ایک غریب مگر باعزت گھرانے کی فرد تھی۔ والد کے انتقال کے بعد اس نے زندگی کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ خصوصاً ان ماموؤں کے بدلتے انداز نے جن کی پرورش ہی اس کی ماں کے ہاتھوں ہوئی تھی، کنول کو زندگی کو پرکھنے کا بہت موقع دیا تھا۔ وہ گھر کی بڑی بیٹی تھی اس نے ماں کی ساری پریشانیوں اور دکھوں کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور پھر مناسب وقت آتے ہی اپنی ذمے داری سمجھتے ہوئے ماں کی سہولت کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ قسمت سے اسے معظم کے پاس ملازمت مل گئی۔ مہذب، پرکشش اور باوقار دکھائی دینے والے معظم کا اپنی طرف جھکاؤ دیکھ کر وہ متاثر تو ہوئی لیکن اپنے وقار کو نہ کھونے دیا۔ تعلق کی نوعیت بدل گئی پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ وہ اور معظم دفتری نوعیت کے معاملات کے علاوہ نجی نوعیت کے مسائل اور باتیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگے لیکن ایسی بے تکلفی دونوں میں سے کسی کے انداز میں بھی جھلکنے نہ پائی کہ دیگر لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل پاتا۔ ان دونوں کی گفتگو ہوتی بھی بہت سادہ تھی۔ کنول کے پاس اپنے گھر والوں کے مسائل حل کر کے انہیں خوشیاں دینے کے چھوٹے چھوٹے خواب تھے تو معظم کے پاس اپنی اکلوتی بیٹی کے قصے۔ اسے پہلی بار دیکھنے سے لے کر اس کے بولنے، قدم اٹھانے، اسکول جانے تک کا ہر قصہ وہ بہت شوق سے کنول کو سناتا۔ بیوی کے بارے میں اس نے کنول کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ

اکثر بیمار رہتی ہے۔ بیوی کی بیماری اور اپنی مصروفیات کی وجہ سے ہی اس نے موموکو مری کا نونٹ میں داخل کروادیا تھا۔ وہ بچی کے دور رہنے سے خوش نہیں تھا لیکن اس کے بہتر مستقبل کے لیے یہی مناسب سمجھتا تھا کہ وہ مری میں رہ کر ہی اپنی تعلیم مکمل کرے۔ وہ مومو سے فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں بھی اکثر کنول کو آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کنول بہت اشتیاق سے اس کی ساری باتیں سنتی تھی۔ مومو، معظم کو عزیز تھی اور خود معظم، کنول کو۔ ایسے میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ مومو سے محبت نہ کرتی۔

چاہت کا تو پہلا اصول ہی یہ ہوتا ہے کہ جسے چاہا جائے اس کی عزیز چیزوں کو اس سے بڑھ کر عزیز رکھا جائے۔ کنول منیر اس اصول سے خوب واقف تھی۔ کیسے واقف نہ ہوتی؟ محبت اپنے اصول وقواعد خود آدمی کو سکھاتی ہے۔ جس دل پر محبت آسمانی تحفے کے مانند اترتی ہے اس دل میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور اس وسعت میں محبوب کے سارے پیارے آسانی سے سمٹ آتے ہیں۔ کنول بھی اس تجربے سے گزر رہی تھی۔ اسے معظم ہی نہیں اس سے وابستہ ہر شے، ہر رشتہ پیارا تھا۔ وہ ان لوگوں پر حیران ہوتی تھی جو محبت میں شیئر کے قائل نہیں ہوتے۔ خود اسے تو محبت نے بانٹنا ہی سکھایا تھا۔ وہ ہر اس شخص سے محبت کرنے کو تیار تھی جس کا معظم کی محبت میں حصہ تھا۔ اسے کسی اور کے معظم کی محبت میں حصہ دار ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا وہ تو خود اپنے حصے پر قانع اور شاکر تھی۔ جو کچھ اسے ملا تھا اور مل رہا تھا وہ نہ ملتا تو وہ اس پر اپنے حق کا دعویٰ تو نہیں کرسکتی تھی۔ یہ طرز فکر ایسا تھا جس نے اسے شکر گزاری کی طرف مائل کردیا تھا۔ شکر گزار ہونا خود اپنی جگہ کتنی بڑی نعمت ہے یہ تو اس نعمت سے مالا مال بندہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

☆☆☆

''تیرا بخار تو ابھی تک کم نہیں ہوا۔'' شمس علی نے چارپائی پر لیٹی حسینہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بخار کی حدت محسوس کرتے ہوئے تشویش سے بولا۔ اس دن کے واقعے کے بعد دونوں میں کھچاؤ سا آگیا تھا لیکن دو دن سے شدید بخار میں مبتلا حسینہ کی تکلیف نے شمس علی کا دل اس کے لیے پھر سے موم کردیا تھا۔

''میں انور کے ساتھ تیار لفافے دینے بازار تک جارہا ہوں۔ واپسی میں ڈاکٹر کو بھی دیکھتا آؤں گا۔ ذرا پوچھوں تو اس سے کہ دوا کھانے کے باوجود بخار اتر کیوں نہیں رہا۔''

حسینہ نے شمس علی کی پہلی بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا اس بار بھی بس ذرا سا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ بخار کے باعث نقاہت اتنی ہوتی تھی کہ کچھ بولنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

''دروازہ بند کرلے ناجیہ! میں اور انور جارہے ہیں۔'' شمس علی نے بائیں ہاتھ میں لفافوں کا بنڈل اٹھاتے ہوئے ناجیہ کو آواز دی۔ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار انور نے بھی دونوں ہاتھوں سے تیار شدہ لفافوں کا ایک بنڈل تھام رکھا تھا۔ ناجیہ جو باورچی خانے میں مصروف تھی شمس علی کی آواز پر باہر نکلی۔ ''ابا! ذرا اظہر کو بھی دیکھ لینا۔ میدان میں کھیلنے کے لیے گیا تھا اب تک واپس نہیں آیا۔''

شمس علی اور انور کے پیچھے دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے شمس علی کو ایک اور کام بتایا اور پھر کمرے میں حسینہ کے پاس آگئی۔

''تمہارے لیے دلیا پکادوں اماں؟ تم نے دو دن سے ڈھنگ سے کچھ بھی نہیں کھایا۔'' حسینہ کے قریب چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دباتے ہوئے ناجیہ نے اس سے پوچھا۔

''رہنے دے کچھ بھی کھانے کو دل نہیں کررہا۔'' حسینہ نے کراہتے ہوئے انکار کیا۔

''پر کچھ تو کھانا ضروری ہے۔ خالی پیٹ دوا کیسے کھاؤ گی؟'' ناجیہ نے اصرار کیا۔

''چائے بسکٹ کھالوں گی۔ تجھے جان مارنے کی ضرورت نہیں۔'' حسینہ نے اس کی بات کا جواب دے کر آنکھیں موند لیں۔ ناجیہ بیٹھی اس کے پیر دباتی رہی۔ حسینہ کو اس کی یہ خدمت گزاری بہت بھاتی تھی۔ وہ اس کی سگی بیٹی نہیں تھی لیکن خدمت بالکل ویسے ہی کرتی تھی۔ حسینہ کے اپنے دل میں ناجیہ کے لیے بڑا پیار تھا۔ وہ اس کے لیے بہت اونچے خواب دیکھتی تھی۔ وہ تو گھریلو حالات کی وجہ سے ناجیہ مڈل سے آگے پڑھ نہیں سکی، پھر اس کا اپنا دل بھی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا ورنہ حسینہ کی تو خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ جائے تاکہ اس کی کسی اچھی جگہ شادی ہوسکے۔ اب بھی وہ اس خواہش سے دستبردار نہیں ہوئی تھی اور اسے امید تھی کہ جلد اس کی یہ خواہش پوری ہوجائے گی۔ ناجیہ اپنے لیے حسینہ کے ان جذبات سے واقف تھی اسی لیے تو سگی ماں سے بڑھ کر اس کا احترام کرتی تھی۔ سوتیلی ماؤں کے جتنے قصے اس نے سن رکھے تھے حسینہ میں ان کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ملتی تھی۔ انور، اظہر پر تو وہ شاید کبھی سختی کر بھی جاتی ہو لیکن ناجیہ پر ہمیشہ مہربان رہتی تھی۔

''بس چھوڑ دے میرے پاؤں۔ پہلے جاکر کھانا

پکا لے۔ تیرے ابا اور بھائی واپس آ کر کھانا مانگیں گے۔'' حسینہ نے کروٹ لیتے ہوئے مسلسل بیزار باتی ناجیہ سے کہا تو وہ اٹھ کر واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔ چولہے پر چڑھی مونگ کی دال اس دوران گل چکی تھی۔ ناجیہ بگھار کے لیے پیاز کاٹنے لگی۔ آٹا وہ پہلے ہی گوندھ کر رکھ چکی تھی کہ ٹھہر کر روٹیاں ڈال لے گی۔ دال بگھار کر فارغ ہونے کے بعد اس نے چولہے پر توا چڑھایا اور آٹے کا پیڑ ابنانے لگی۔ ابھی پہلا ہی پیڑ ابنا تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ شمس علی اور انور، اظہر کے واپس آنے کا قیاس کرتے ہوئے اس نے تیزی سے جا کر دروازہ کھولا پر سامنے موجود شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ تو چھوٹے شاہ صاحب تھے۔

''السلام علیکم۔'' بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے انہیں سلام کیا اور اپنا بے پروائی سے اوڑھا گیا دوپٹا درست کرنے لگی۔

''وعلیکم السلام۔ کیا اندر نہیں بلاؤ گی؟'' چھوٹے شاہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''آ جائیں۔ اماں اندر کمرے میں لیٹی ہیں۔ میں انہیں آپ کے آنے کا بتاتی ہوں۔'' ناجیہ تیزی سے اندرونی کمرے کی طرف بھاگی۔ چھوٹے شاہ نے بھی اس کی پیروی میں اس کمرے کا رخ کیا۔

''میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی مسئلہ ہے ورنہ حسینہ بی اور دو دن کی اکٹھی چھٹی کرے ممکن ہی نہیں۔ خیریت معلوم کرنے کے خیال سے ہی میں یہاں آیا تھا۔'' حسینہ کے چہرے سے ہی اس کی طبیعت کی خرابی کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ بولتا ہوا وہاں رکھی پلاسٹک کی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بڑی مہربانی چھوٹے شاہ صاحب۔'' حسینہ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھی اور پھر ناجیہ سے بولی۔ ''جا، جا کر شاہ صاحب کے لیے اچھی سی چائے تو بنا لا۔'' ناجیہ فوراً ہی تعمیل حکم میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟'' چھوٹے شاہ نے تشویش سے حسینہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تھا پر دوا کھانے کے باوجود آرام نہیں آ رہا۔'' حسینہ نے جواب دیا۔

''یہ تو اچھی بات نہیں۔ ایسا کرو میرے ساتھ چلو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔'' چھوٹے شاہ نے پیشکش کی۔

''نہیں۔ پہلے ہی شمس علی ناراض ہے۔ اسے آپ کی ہم پر مہربانیاں اچھی نہیں لگتیں۔''

حسینہ نے انکار کیا تو وہ چپ ہو گیا۔

''آپ بیٹھیں میں ذرا منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر تیار ہو آؤں۔ کب سے ایسے ہی پڑی ہوں۔'' خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد حسینہ نے چھوٹے شاہ سے کہا اور یہ کہہ کر چارپائی سے اتر کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ شدید نقاہت نے اس کی اس کوشش کو ناکام کر دیا اور اسے بری طرح چکر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر جاتی چھوٹے شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھر احتیاط سے دوبارہ چارپائی پر لٹانے لگا۔ عین اسی وقت شمس علی نے دونوں بیٹوں کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ ناجیہ گھبراہٹ میں بیرونی دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی اس لیے وہ لوگ سیدھے اندر چلے آئے۔ کمرے کا منظر پہلے ہی سے شک میں مبتلا شمس علی کے لیے ایک تازیانہ تھا۔ اس کی بیوی، اس کے گھر میں ایک غیر آدمی کی بانہوں میں تھی وہ کیونکر اس بات کو برداشت کر پاتا۔ غیرت جوش میں آئی اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے اکلوتے ہاتھ سے چھوٹے شاہ کا گریبان پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔ چھوٹے شاہ کا سارا دھیان حسینہ کی طرف تھا۔ اس اچانک لگنے والے جھٹکے سے وہ بری طرح لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گرا۔

''بہت ہو گئی یہ بے غیرتی۔ بہت برداشت کر لیا میں نے۔ اب تو ایک دن بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔'' اب شمس علی کی مخاطب حسینہ تھی۔ اسے کچھ بھی سمجھنے کی مہلت دیے بغیر اس نے چھوٹے شاہ کے انداز میں ہی جھٹکا دے کر چارپائی سے دھکیلا اور غصے سے دھاڑا۔ ''نکل جا اپنے یار کے ساتھ میرے گھر سے۔ میں نے تجھے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی۔''

ناجیہ کی بلند چیخ، حسینہ کی پھٹی ہوئی آنکھیں اور چھوٹے شاہ کا حیران پریشان چہرہ کچھ بھی شمس علی کے لفظوں کے آگے بند نہ باندھ سکا اور آناً فاناً سب کچھ ختم ہو گیا۔

☆☆☆

''السلام علیکم پاپا!'' ائیر پورٹ پر معظم پر نظر پڑتے ہی اس کی کھلی بانہوں میں سما جانے والی وہ تیرہ چودہ سالہ لڑکی یقیناً مریم عرف موموہی تھی۔ سلام جواب کے مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ معظم کو بتانے سے لگی کسی چھوٹی بچی کی طرح اسے بتا رہی تھی کہ اس نے معظم کو کتنا مس کیا۔ معظم چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ لیے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ کنول دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے باپ بیٹی کے درمیان مخل ہونے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔ بالآخر معظم کو ہی خیال آیا اور وہ کنول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹی

سے بولا۔

''ان سے ملو مومو! یہ کنول منیر ہیں میری نئی سیکریٹری۔''

''ہیلو۔ نائس ٹو میٹ یو۔'' موموں نے مسکرا کر کنول سے ہاتھ ملایا۔

''مجھے بھی تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔'' کنول نے مومو کے چہرے پر ایک پیار بھری تھپکی دی۔

وہ سچ مچ مومو سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔ جینز اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ میں ملبوس گوری رنگت اور دراز قد رکھنے والی مومو کی آنکھیں بالکل معظم جیسی تھیں۔ اس کی آنکھوں کا تاثر بھی معظم جیسا نرم اور کچھ کھویا کھویا سا تھا۔

''چلو گھر چلتے ہیں۔ باقی باتیں گھر جا کر ہوں گی۔ تمہاری مما انتظار کر رہی ہوں گی۔''

معظم نے مومو کا بیگ خود اٹھاتے ہوئے اس سے کہا تو وہ کنول کے ساتھ چپ چاپ معظم کے پیچھے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔ واپسی کے سفر میں زیادہ تر مومو ہی باتیں کرتی رہی۔ معظم اس کی باتوں کے مختصر جواب دینے یا مسکرانے پر اکتفا کرتا رہا۔ اس کے اس انداز سے بے نیاز مومو نے بے تکان گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

''آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہیں مس کنول؟ ایکچولی بات یہ ہے کہ پاپا کہتے ہیں کہ انہیں مجھ سے باتیں کرنے سے زیادہ میری باتیں سننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ میں پاپا کو خوش کرنے کے لیے اتنی ساری باتیں کرتی ہوں ورنہ اتنی زیادہ باتونی ہوں نہیں۔'' بولتے بولتے اسے دھیان آیا تو کنول سے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے رویے کی بھی وضاحت کرنے لگی۔ کنول نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ویسے معظم کے چہرے پر موجود تاثرات مریم کے بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔ معظم کو اتنا خوش اور مسرور اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آدھے گھنٹے کا سفر طے کر کے وہ لوگ معظم کے گھر جا پہنچے۔ کنول کا خیال تھا کہ معظم اسے آفس پر ڈراپ کر دے گا لیکن وہ تو اسے گھر تک لے آیا تھا۔ پہلی بار اسے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ معظم کی بیٹی سے ملنا اور بات تھی، معظم کی بیوی کا سامنا کرنا اور بات۔ وہ عورت بیس سال سے معظم کی زندگی میں شامل تھی۔ یقیناً معظم پر صرف اپنے حق کی دعوے دار بھی ہوگی۔ اگر جو اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ انیس سالہ لڑکی اس کے شوہر کی محبت میں حصہ دار بن بیٹھی ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوتا؟ اپنی بیس سالہ رفاقت کا غرور ایک انیس سالہ لڑکی کے ہاتھوں ٹوٹنے کا صدمہ کسی عورت کے لیے معمولی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ معظم کی محبت دل میں بسا کر اس کے سب رشتوں کے لیے بھی اپنے دل میں کشادگی پیدا کر لینے والی کنول نے معاملے کو کبھی اس رخ سے تو دیکھا ہی نہیں تھا۔ پہلی بار اسے خیال آ رہا تھا کہ اسے معظم کی بیوی کے وجود پر اعتراض نہیں بلکہ وہ تو ایک طرح سے اس سے بھی محبت کرتی ہے یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن ضروری تو نہیں کہ معظم کی بیوی بھی اس کے لیے اپنے دل میں گنجائش پیدا کر سکے۔

''رک کیوں گئیں؟ اندر چلو۔'' معظم نے اس کا ٹھٹک کر وہیں رک جانا محسوس کیا تو اسے ٹوکا۔ کنول نے ناچار قدم اندر کی طرف بڑھائے۔ اب یہاں تک آ کر واپس پلٹ جانا بھی تو ممکن نہیں تھا وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔ دل شدت سے خواہشمند تھا کہ اس گھر کے چپے چپے کو اپنی نظروں سے چومے کہ یہ معظم کا گھر تھا لیکن اپنے حقدار نہ ہونے کا احساس اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

''آیئے نا مس کنول۔'' مومو جو پہلے ہی اندر جا پہنچی تھی کنول کو دیکھ کر اس سے بولی اور پھر مڑ کر اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔

''آپ مس کنول کو جانتی ہیں مما؟ یہ پاپا کی نئی سیکریٹری ہیں۔'' سوال کرتے ہوئے اس نے تعارف بھی خود ہی کروا دیا تھا۔ کنول نے سر اٹھا کر مومو کے ساتھ کھڑی عورت کو دیکھنا چاہا۔ عورت پر پہلی نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونکی۔ وہ عورت معظم کی بیوی ہے اسے قطعی یقین نہیں آیا۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، لاغر جسم، سیاہی مائل رنگت اور سب سے بڑھ کر بہت واضح طور پر محسوس ہونے والا عمر کا فرق۔ اسے لگا کہ اس عورت کو معظم کی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروا کر اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا تھا۔ لیکن ایسا بے ہودہ مذاق کم از کم کوئی بیٹی تو نہیں کر سکتی تھی تو پھر اس کا مطلب تھا تقدیر نے معظم کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ وہ عورت کہیں سے بھی تو اس کی بیوی نظر نہیں آتی تھی۔

''تشریف رکھیں کنول۔'' کنول کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بہت نرمی سے اسے بیٹھنے کو کہا تو کنول ٹپٹاتی ہوئی ایک قریبی صوفے پر ٹک گئی۔ وہ شکر کر رہی تھی کہ معظم تعارف کے اس مرحلے کے دوران موجود نہیں تھا۔ وہ یہاں رکے بغیر اندرونی حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ شاید اسے کنول کے ردعمل کا اندازہ تھا۔

٭٭٭

''آج تم ہمارے ساتھ ڈنر پر چلنا کنول! آج موموکا برتھ ڈے ہے۔ اصل میں، میں نے اسے اسپیشلی بلوایا ہی اس وجہ سے ہے ورنہ ابھی تو اس کا سیشن چل رہا ہے۔ پرسوں وہ واپس بھی چلی جائے گی۔ میں چاہتا ہوں اس کے جانے سے پہلے تمہاری اس سے کم از کم ایک ملاقات اور ہو جائے۔'' دوسرے دن آفس میں معظم نے کنول سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا ہوا؟ کوئی مسئلہ ہے؟ اگر ڈنر پر چلنا تمہارے لیے مشکل ہے تو لنچ کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔'' معظم نے اسے سوچ میں پڑتے دیکھ کر کہا۔

''یہ مسئلہ نہیں ہے سر! بلکہ میرے خیال میں ڈنر ہی زیادہ بہتر رہے گا۔'' کنول نے فوراً ہی معظم کے خیال کی تردید کرتے ہوئے پہلے پروگرام کی حمایت کی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈنر پر جانے کی صورت میں اسے درمیان میں مومو کے لیے تحفہ خریدنے کا موقع مل جائے گا پھر اس کا پہنا ہوا لباس بھی کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جانے کے لیے اتنا مناسب نہیں تھا اس حساب سے بھی اسے ڈنر کی دعوت ہی مناسب محسوس ہو رہی تھی مگر سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اس فیملی ڈنر میں شرکت کے حوالے سے تذبذب کا شکار تھی کہ جانے اس کی شمولیت کو کس انداز میں لیا جاتا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں بھی ڈنر زیادہ سوٹ کر رہا ہے۔ پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ نہیں ہم لوگ خود تمہیں تمہارے گھر سے لے لیں گے۔'' اس کی رضامندی پا کر معظم آگے کا پروگرام طے کرنے لگا۔

''اگر میں اس ڈنر میں شرکت نہ کروں تو......؟'' کنول نے معظم کے پُرجوش انداز سے نظر چرا کر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''وجہ......؟'' معظم نے غور سے اسے دیکھا۔

''کچھ عجیب سا لگتا ہے پتا نہیں آپ کی مسز کیا سوچیں گی اور شاید مومو کو بھی اچھا نہ لگے ایک آؤٹ سائڈر کا اپنے فیملی ڈنر میں شریک ہونا۔'' کنول نے اپنی الجھن بیان کی۔

''اگر صرف یہی دو مسئلے ہیں تو یقین کرو میری مسز نے خود تمہیں انوائٹ کرنے کو کہا ہے۔ رہی مومو، تو اسے تو خود تم بہت اچھی لگی ہو۔ وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہو گی۔'' معظم نے جیسے چٹکی بجاتے میں کنول کا مسئلہ حل کر دیا تھا لیکن اس کے چہرے سے تذبذب اب بھی غائب نہیں ہوا تھا۔

''اور بھی کوئی مسئلہ ہے؟'' معظم نے اس کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں مسئلہ تو نہیں ہے بس مجھے آپ کی مسز کا سامنا کرتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کی مجرم ہوں جو ان کے ساتھ خیانت کی مرتکب ہو رہی ہوں۔''

کنول اپنا مسئلہ زبان پر لے ہی آئی۔ معظم نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور قدرے توقف کے بعد بولا۔

''تم غلط سوچتی ہو۔ اول تو ہمارے درمیان جو تعلق ہے اسے جرم کہا ہی نہیں جا سکتا۔ بے اختیاری میں قائم ہونے والا یہ تعلق بہت پاکیزہ بنیادوں پر قائم ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان کبھی ایسا کچھ نہیں ہوا جس پر شرمسار ہو کر ہم خود کو مجرم تصور کریں۔ دوم یہ کہ اگر اس تعلق پر کوئی اعتراض کیا ہی جائے تو پھر بھی مجرم تم نہیں میں کہلاؤں گا۔ اس معاملے میں میری بیوی کے پاس صرف میرا احتساب کرنے کا حق ہے مگر یقین جانو کہ اس کی بھی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میری بیوی ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو شوہر پر کسی دوسری عورت کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ میں اگر اس سے بات کروں تو وہ خوشی خوشی مجھے اجازت دے دے گی کہ میں تمہارے اور اپنے تعلق کو قانونی اور شرعی رشتے میں تبدیل کر دوں۔ اس معاملے میں کوئی رکاوٹ ہے تو وہ خود میں ہوں۔ مجھے خود سے تئیس چوبیس سال چھوٹی لڑکی کو اس حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنا عجیب لگتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ مجھ سے تمہارے معاملے میں کوئی حق تلفی نہ ہو جائے۔ میرا ساتھ تمہیں ان خوشیوں سے محروم نہ کر دے جو کسی ہم عمر جیون ساتھی کے ساتھ تمہیں مل سکتی ہیں۔ پھر ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ ہو سکتا ہے تم محض کسی وقتی جذبے سے متاثر ہو کر میری طرف متوجہ ہوئی ہو...... بعد میں تمہیں اپنی حماقت کا خیال آئے۔ ایسی صورت میں محبت کے خوابوں کے ساتھ شروع ہونے والی زندگی جہنم بن جائے گی۔ اپنے اتنے خوبصورت تعلق کا ایسا بھیانک انجام برداشت نہیں ہو گا مجھ سے۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ معظم اتنا کھل کر اس موضوع پر کنول سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کنول سے متعلق اپنے احساسات بتانے کے ساتھ ساتھ اپنے خدشات بھی بیان کر دیے تھے۔

''مجھے آپ کی مسز کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی کہ ایسی بھی خواتین ہوتی ہیں جو شوہر کے معاملے میں اتنی وسیع القلبی کا مظاہرہ کریں لیکن بہرحال ان کی یہ وسیع القلبی میرے لیے خوش آئند ہے۔ کم از کم میرے دل سے یہ بوجھ ہٹ گیا کہ میں ان کی دل آزاری کا سبب ہوں گی۔ اب رہی

آپ کی گفتگو کے دوسرے حصے کی بات تو میں آپ سے صرف یہ کہوں گی کہ آپ عمر میں مجھ سے تیس چوبیس سال بڑے ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی حقیقت نظر انداز کرنے کی غلطی کر رہے ہیں۔ خوشی کا تعلق انسان کے دل سے ہوتا ہے نہ کہ ہم عمری، خوبصورتی اور دولت وغیرہ سے۔ دل کی مراد پوری ہو جائے تو باقی چیزوں پر بے خوشی سمجھوتا کر لیا جاتا ہے۔ عورت تو ایسے سمجھوتے، سمجھوتا سمجھ کر نہیں اپنی محبت کی معراج سمجھ کر بہت خوش دلی سے کر لیتی ہے۔'' کنول کی آواز اندرونی جذبات سے کپکپا رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم ہی اپنی جگہ سے یوں اٹھی جیسے فوراً کمرے سے باہر نکل جائے گی لیکن باہر نکلنے سے قبل معظم کی میز پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا ٹھہرتے ہوئے بولی۔

''آپ کو لگتا ہے کہ میں محض وقتی جذباتیت کا شکار ہوں تو جس طرح چاہیں آزما کر دیکھ لیجیے گا میں جیسی انیس سال کی عمر میں ہوں آج سے انیس سال بعد بھی آپ مجھے ویسا ہی پائیں گے۔'' اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ معظم اس کے اپنے آفس سے باہر نکل جانے کے بعد بھی بہت دیر تک اس کے لہجے کی پختگی کے احساس میں ڈوبا رہا۔ اس کی جہاندیدگی سمجھا رہی تھی کہ کنول منیر کا دعویٰ غلط نہیں وہ واقعی اپنے جذبوں میں بہت خالص تھی اور اس کا یہ خالص پن ہی معظم کو خوفزدہ کر دیتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ اس جیسا زخم زخم اندر سے ٹوٹا ہوا، ڈھلتی عمر کا مرد جانے ان خالص جذبوں کی مالک لڑکی کے ساتھ انصاف کر بھی سکے گا یا نہیں؟

☆☆☆

بہت سارے دن خاموشی سے گزر گئے۔ موموا اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنی سالگرہ منا کر واپس مری جا چکی تھی۔ آفس کا کام روٹین کے مطابق چل رہا تھا۔ معظم کی وہی مصروفیات تھیں فیکٹری کے معاملات میں الجھا وہ اپنی ذات کے لیے بھی بہت کم وقت نکال پاتا تھا۔ کنول بھی اسے چھیڑے بنا اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھی۔ ایک طرف اسے گھر کے سدھرتے ہوئے حالات نے مطمئن کر رکھا تھا تو دوسری طرف معظم کے قریب رہنے کا احساس خوش رکھتا تھا۔ اس کی محبت نے بہت زیادہ کی طلب کبھی نہیں کی تھی۔ معظم کو روز دیکھ لینا اور اس کی آواز سن لینا ہی اس کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اس تعلق کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے سامنے یہ مسئلہ بھی نہیں تھا کہ معظم اسے اپنائے گا یا نہیں؟ وہ اپنے دل کے اس خوبصورت احساس کے ساتھ خوش تھی جو معظم کی محبت کی دین

تھا۔ یہ احساس اتنا انوکھا، اتنا سرور انگیز تھا کہ کنول کو لگتا ساری دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہے۔ ان ہی خوشیوں بھرے دنوں میں ایک دن اسے معظم کے چہرے پر پریشانی کے سائے نظر آئے۔

''خیریت تو ہے سر! آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ مومو تو ٹھیک ہے نا؟''

سیکریٹری کی حیثیت سے کنول کو علم تھا کہ فیکٹری کے تمام معاملات ٹھیک چل رہے ہیں ایسے میں اگر معظم پریشان تھا تو اس کا مطلب تھا کہ پریشانی نجی نوعیت کی ہے۔ نجی پریشانی کا خیال آتے ہی کنول کا دھیان سب سے پہلے مومو کی طرف گیا تھا چنانچہ اس نے اسی حوالے سے معظم سے سوال کیا۔

''مومو ٹھیک ہے مگر اس کی مما کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کل رات ہی میں نے اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروایا ہے۔ ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ اس کے پھیپھڑے بالکل جواب دے چکے ہیں۔ باقی وہ ابھی ٹیسٹ وغیرہ کر رہے ہیں اس کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دیں گے۔'' معظم نے کنول کو بتایا۔

''ایسے اچانک کیسے ان کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی؟ کیا پہلے بھی ان کے ساتھ کوئی پرابلم تھا؟''

کنول کو بھی اس خبر سے صدمہ ہوا تھا۔ اسے مومو کا برتھ ڈے ڈنر یاد آ گیا تھا۔ وہ جتنا ڈرتی ڈرتی اس ڈنر میں شرکت کے لیے گئی تھی معظم کی بیوی کے رویے نے وہ سارا ڈر ختم کر دیا تھا۔ کنول سے وہ بے حد محبت سے بالکل ایسے ملی تھی جیسے وہ اس کے گھر کی ہی ایک فرد ہو۔

''بیمار تو وہ اکثر ہی رہتی تھی لیکن اس کی بیماری اتنی شدت اختیار کر چکی ہے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ شاید پچھلے بیس برسوں سے اسے اس حال میں دیکھ دیکھ کر میں عادی ہو گیا تھا جو اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ وہ کتنی شدید بیمار ہے۔ آج مجھے اپنی اس کوتاہی پر احساس جرم ہو رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود اپنی پروا کبھی نہیں کرتی پھر میں نے اس کی پروا کیوں نہیں کی؟'' معظم کے چہرے پر حقیقی دکھ تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں سر! انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' کنول نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''تم دعا کرنا کنول! ورنہ میں مومو کو کیا جواب دوں گا؟ وہ مجھ سے شکوہ کرے گی کہ پاپا آپ نے میری مما کا خیال نہیں رکھا۔'' کنول کو لگا کہ معظم کی آنکھوں میں نمی سی آگئی ہے۔ اس سے قبل کہ کنول اس کی تسلی کے لیے مزید الفاظ ادا

کرتی معظم نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور کنول کو ہدایت دی۔

''ذرا افتخار صاحب کو میرے پاس بھیجو۔ میں انہیں چند ضروری انسٹرکشنز دے کر دوبارہ ہاسپٹل جاؤں گا۔ ممکن ہے چند دن میں یہاں آ ہی نہ سکوں۔'' کنول نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور خود واپس اپنے کیبن میں آ گئی۔ معظم پندرہ بیس منٹ افتخار صاحب سے بات کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے کنول سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ کنول نے اس بات کا برا نہیں مانا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ معظم کتنا پریشان ہے۔ وہ عورت جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کے بیس برس گزارے تھے ہاسپٹل میں شدید بیمار پڑی تھی ایسے میں وہ کنول کو نظر انداز کر گیا تھا تو یہ شکایت کا مقام نہیں تھا۔ کنول تو خود بے حد مضطرب تھی۔ اسے رہ رہ کر معظم کی بیوی کا محبت بھرا رویہ یاد آ رہا تھا۔ وہ معظم کے ساتھ بے جوڑ لگتی تھی یا اس کی معظم کے ساتھ بہت زیادہ مضبوط ریلیشن شپ نظر نہیں آئی تھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کنول اس سے دو ملاقاتوں کے بعد ہی اس بات کی معترف ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبت کرنے والی، پرخلوص عورت ہے۔ غور سے دیکھنے پر کنول کو اس بات کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ وہ کبھی خوبصورت رہی ہو گی لیکن وقت اس کے حسن کو چاٹ گیا تھا۔ کنول نہیں جانتی تھی کہ معظم اور اس کی شادی کن حالات میں اور کیونکر ہوئی لیکن اسے اندازہ تھا کہ وہ حالات یقیناً غیر معمولی ہوں گے۔

کنول کا وہ سارا دن معظم کی بیوی کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے گزرا۔ کاموں کی انجام دہی کے دوران اس کی ذہنی رو بار بار بھٹک کر اس کی طرف چلی جاتی اور وہ دل ہی دل میں اس کی صحتیابی کے لیے دعائیں کرنے لگتی۔

☆☆☆

''ہیلو، آپ معظم صاحب کی سیکریٹری مس کنول منیر بات کر رہی ہیں؟'' دوسرے دن کنول اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھی کہ لنچ ٹائم سے آدھا گھنٹا قبل فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھانے پر اس سے ایک نسوانی آواز نے استفسار کیا۔

''یس! میں معظم صاحب کی سیکریٹری کنول منیر بات کر رہی ہوں۔ آپ کون صاحبہ ہیں؟''

کنول نے تصدیق کرتے ہوئے فون کرنے والی سے اس کے بارے میں پوچھا۔

''میں مسز معظم کی اٹینڈنٹ ہوں۔ ان کے کہنے پر ہی میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ مسز معظم کی خواہش ہے کہ آپ آج لنچ ٹائم میں ان سے ہاسپٹل آ کر ملاقات کریں۔''

نسوانی آواز نے اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ جلد از جلد ہاسپٹل پہنچ جاؤں۔'' کنول کو حیرت تھی کہ معظم کی بیوی نے خاص طور پر اس سے ملاقات کی خواہش کیوں کی ہے لیکن اس حیرت کو ظاہر کیے بغیر اس نے فوراً ہی ہاسپٹل آنے کی ہامی بھر لی۔ یوں بھی وہ آج مسز معظم کی مزاج پرسی کے لیے شام میں امی کے ساتھ ہاسپٹل جانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر اس خصوصی بلاوے کے بعد اس نے مناسب یہی سمجھا کہ ابھی اکیلی جا کر ملاقات کر لے اور امی کو پھر کسی دن لے جائے۔ ہاسپٹل، فیکٹری سے کافی فاصلے پر تھا۔ اندازاً کنول کو وہاں پہنچنے میں پون گھنٹا تو لگ ہی جاتا۔ کنول فون بند کر کے فوراً ہی افتخار صاحب کو بتا کر روانہ ہو گئی۔ روم نمبر وغیرہ وہ معلوم کر چکی تھی اس لیے ہاسپٹل پہنچ کر اسے اپنے مطلوبہ کمرے تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ صاف ستھرے کمرے میں، سینے تک سفید چادر اوڑھے معظم کی بیوی بستر پر نیم دراز تھی۔ کنول کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا۔ کنول پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرائی پر اس مسکراہٹ سے بھی اس کی نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ کنول کو وہ پہلی دو ملاقاتوں کے مقابلے میں بے حد کمزور محسوس ہوئی۔

''آؤ کنول! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' کنول کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے بہت خوش دلی اور بے تکلفی سے اس سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے میم کہ آپ کو مجھے بلانے کی زحمت کرنی پڑی۔ اصل میں کل سر اتنی جلدی میں تھے کہ میں ان سے ہاسپٹل وغیرہ کے بارے میں معلوم ہی نہیں کر سکی۔ آج آفس آنے کے بعد میں نے افتخار صاحب سے ساری انفارمیشنز لی ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ شام میں گھر واپس جانے کے بعد اپنی امی کے ساتھ آپ کی مزاج پرسی کے لیے آؤں گی'' کنول نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے وضاحت دی۔

''میں نے کوئی شکایت تو نہیں کی۔ بس میرا دل چاہ رہا تھا تم سے ملنے کا اس لیے میں نے تمہیں بلوا لیا۔'' اس نے کہا تو کنول سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ خیال اب بھی اس کے ذہن میں تھا کہ معظم کی بیوی نے اسے خاص طور پر کیوں بلایا ہے۔

''نرس! تم ایسا کرو کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ۔ یہ

کنول بہت پیاری لڑکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بہت اچھی اٹینڈنٹ ثابت ہوگی۔ جب تک یہ یہاں ہے تم میری طرف سے خود کو فارغ سمجھو۔''

کنول کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس سے کچھ کہنے کے بجائے معظم کی بیوی نے نرس کو حکم دیا۔ نرس اثبات میں سر ہلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کنول کو اپنے اعصاب کشیدہ سے محسوس ہونے لگے۔ معظم کی بیوی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے اسی لیے نرس کو باہر بھیج کر پرائیویسی کا انتظام کیا گیا ہے۔

''سر کہاں ہیں؟ انہیں تو یہاں آپ کے پاس ہاسپٹل میں ہونا چاہیے تھا۔'' کنول کو کچھ اور سمجھ نہ آیا تو معظم کے بارے میں ہی پوچھ بیٹھی۔

''انہیں ان کے ایک دوست نے کسی بہت اچھے ڈاکٹر کے بارے میں بتایا ہے وہ میری رپورٹس لے کر اس ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے گئے ہیں۔ بے چارے پچھلے بیس سال سے اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح میرے مردہ تن میں زندگی پھونک سکیں۔'' معظم کی بیوی کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔

''آپ انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی میم! سر آپ کی بہت فکر کرتے ہیں۔ وہ آپ کا اچھے سے اچھا علاج کروائیں گے۔'' کنول نے اس زندگی سے مایوس بیمار عورت کو تسلی دینی چاہی۔

''مجھے معلوم ہے کہ معظم میری بہت فکر کرتے ہیں۔ ان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ دوسروں کی بھلائی کی خاطر کسی بھی حد تک چلے جاتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں بہ یک وقت اداسی اور احترام کے رنگ تھے۔

''پتا ہے کنول! معظم اتنے اچھے، اتنے مہربان ہیں کہ میں ہر وقت اللہ سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ اللہ ان کو زندگی کی بچی خوشیاں اور راحتیں عطا کرے۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار اپنے گھر میں دیکھا تو مجھے لگا میری دعائیں قبولیت کے درجے پر پہنچنے لگی ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے معظم کچھ بدلے بدلے اور خوش نظر تو آرہے تھے لیکن میں وجہ کا صحیح طرح اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ تمہیں دیکھا تو معظم کی خوشی کی وجہ سمجھ آگئی۔ جانتی ہو اتنے برسوں میں تم واحد لڑکی ہو جسے میں نے معظم کے ساتھ اپنے گھر آتے دیکھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم معظم کے لیے بہت خاص ہو۔ اسی لیے میں نے معظم کو تمہیں مومو کی سالگرہ پر بلانے کے لیے کہا۔ ڈنر کے دوران تمہارا مومو اور مجھ سے جو سلوک تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم بھی اپنے دل میں معظم کے لیے خاص جذبات رکھتی ہو۔ تمہاری کم عمری کے باعث مجھے جو خدشہ تھا کہ کہیں معظم اپنے جذبوں میں تنہا نہ ہوں، وہ اس ملاقات کے بعد دور ہو گیا۔ میں نے جان لیا کہ تم معظم کے لیے ایک بہترین ساتھی ثابت ہوگی۔ پھر تمہارا مومو سے پیار بھی میرے اطمینان کا باعث بنا۔ اگرچہ تم عمر میں اس سے چند برس ہی بڑی ہو لیکن میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہارے دل میں اس کے لیے ممتا ہے۔ تم میرے بعد، میری مومو کو وہ پیار دے سکو گی جو میں سگی ماں ہوتے ہوئے بھی اسے نہیں دے سکی۔'' اس کی آنکھوں میں نمی امڈ آئی تھی جسے وہ ٹشو پیپر سے صاف کرنے لگی۔ کنول تو اتنی شدید حیرت میں مبتلا تھی کہ اسے تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔

''تم حیران ہو رہی ہوں گی کہ میں کیسی باتیں کر رہی ہوں یا یہ کہ میں نے ان سب باتوں کا اندازہ کیسے لگایا لیکن اگر تم میری عمر اور تجربے کو سامنے رکھو تو تمہاری حیرت دور ہو جائے گی۔ تم سے تو خیر میں بہت ہی زیادہ بڑی ہوں لیکن معظم بھی عمر اور تجربے میں مجھ سے کہیں کم ہیں۔ تم دونوں کی خاموشی کے باوجود میری تجربہ کار نگاہوں سے تمہارے دلوں کا حال چھپنا مشکل تھا۔ اگر میں غلط کہہ رہی ہوں تو تم میری بات کی تردید کر سکتی ہو۔''

اس نے کنول کی آنکھوں میں جھانکا۔ کنول نے جواب دینے کے بجائے نظریں جھکا لیں۔ یہ اس کا خاموش اعتراف تھا۔ معظم کی بیوی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے کچھ اور کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کھانسی کے شدید دورے نے اسے مہلت نہ دی۔ کنول جلدی سے اٹھ کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ پھر اس نے سائڈ میں رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے پلایا تب کہیں جا کر اس کی حالت سنبھلی لیکن پھر بھی وہ فوری طور پر کچھ کہنے کے لائق نہیں ہو سکی اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور دوبارہ سلسلۂ گفتگو جوڑا۔

''یقین کرو کنول! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ مجھے تمہارا معظم کی زندگی میں آنا بہت اچھا لگا ہے۔ تم ان سے کسی رشتے میں بندھ گئیں تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوگی۔ البتہ میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں اپنے اور معظم کے حوالے سے کچھ اہم باتیں بتا دوں۔''

''میں آپ کی وہ باتیں بعد میں سن لوں گی میم۔ ابھی آپ آرام کریں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔'' کنول نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے بات کرنے سے روکنا

چاہا۔

''نہیں۔ میں ابھی تم سے سب کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ جانے زندگی مزید مہلت دے یا نہ دے۔ کم از کم مرنے سے پہلے میں معظم کا کچھ تو قرض ادا کر جاؤں۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔ کنول بے بس سی ہوگئی۔

''میں عمر میں معظم سے پورے تیرہ سال بڑی ہوں۔ معظم سے میری شادی ایک حادثہ تھا۔ اس حادثے کی پرورش میرے پہلے شوہر شمس علی کے ایک حادثے میں معذور ہونے کے بعد شروع ہوگئی۔ شمس علی کی معذوری اور گھر کی تنگدستی نے مجھے مجبور کیا کہ میں باہر نکل کر کچھ کمانے کی کوشش کروں۔ معظم کے والد جنہیں سب بڑے شاہ صاحب کہتے تھے کپڑے کی اس مل میں جہاں شمس علی معذور ہونے سے پہلے نوکری کرتا تھا، ٹھیکیدار تھے۔ شمس علی نے بڑے شاہ صاحب سے کہہ کر مجھے کھاتے کے کام میں نوکری دلوا دی۔ ان دنوں معظم کی عمر یہی کوئی بائیس تیئس سال تھی۔ بڑے شاہ صاحب کام سکھانے کی غرض سے انہیں اپنے ساتھ مل لے کر آتے تھے۔ ہم سب کام کرنے والی عورتیں معظم کو ان کے والد کی مناسبت سے چھوٹے شاہ صاحب کہہ کر پکارتی تھیں۔ ایک دن یوں ہوا کہ کام کے دوران شدید گرمی کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی اور میں بے ہوش ہوگئی۔ ساتھی عورتوں نے پانی کے چھینٹے دے کر اور دوسری ترکیبوں سے مجھے ہوش دلایا۔ بڑے شاہ صاحب تک میرے بے ہوش ہونے کی خبر پہنچی تو انہوں نے مہربانی کرتے ہوئے مجھے چھٹی دے دی۔ اس وقت معظم کے دل میں جانے کیا نیکی آئی کہ انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں گھر پہنچانے کی پیشکش کر دی۔ میرے پاس اس روز کرائے تک کے پیسے نہیں تھے اس لیے میں نے ان کی پیشکش قبول کر لی۔ گھر پر معظم کا میری سوتیلی بیٹی سے سامنا ہوگیا۔ اس کی عمر اس وقت یہی کوئی سولہ، ساڑھے سولہ برس ہوگی۔ بے حد معصوم اور پیاری لڑکی تھی۔ معظم کم عمر تھے ان کے دل کو میری سوتیلی بیٹی بھا گئی۔ وہ بہانے بہانے سے میرے گھر آنے لگے۔ میں ان کی دلچسپی کو سمجھ چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اچھا ہے کہ میری بیٹی کا اتنے اچھے لڑکے سے رشتہ ہو جائے۔ میں نے معظم کے اپنے گھر آنے پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اکثر مجھے اپنی گاڑی میں گھر بھی چھوڑ دیتے۔ مقصد بس ایک نظر اسے دیکھنا ہوتا تھا لیکن شمس علی مرد تھا اس نے اس معاملے کو کسی اور نظر سے ہی دیکھنا شروع کر دیا۔ شاید معذوری اور بے روزگاری نے اسے شکی بنا دیا تھا۔ وہ مجھ پر طرح طرح کی پابندیاں لگانے لگا۔ اس کے کہنے پر میں نے ساڑھی چھوڑ کر شلوار قمیص پہننا شروع کر دی، معظم کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر آنا چھوڑ دیا لیکن شمس علی مطمئن نہیں ہوا۔ اس میں کچھ ہاتھ محلے والوں کا بھی تھا جو اس کے کان بھرتے رہتے تھے۔ محلے کے مردوں کی خاص طور پر مجھ پر بڑی نظر رہتی تھی۔ وہ شمس علی کی معذوری اور ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھا کر میرے حسن کو پانے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن میں نے کبھی ان کی ایک نہ چلنے دی۔ مجھ سے انتقام لینے کے لیے انہیں یہی راہ سوجھی کہ شمس علی کے کان میرے خلاف بھرے جائیں۔ ان دنوں جب شمس علی نے مجھ پر معظم کے ساتھ آنے جانے پر پابندی لگا رکھی تھی میں معظم کے اصرار پر ان کے ساتھ خریداری کے لیے بازار چلی گئی۔ انہوں نے شمس علی کی بیٹی کے لیے مجھے کچھ تحفے دلائے کچھ چیزیں میں نے خود خریدیں۔ شمس علی سے میں نے کہہ دیا کہ یہ ساری چیزیں لنڈا بازار سے خریدی ہیں لیکن بدقسمتی سے ایک محلے دار افضل نے مجھے معظم کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے شمس علی کے کان بھر دیے۔ شمس علی نے غصے میں ساری چیزیں جلا ڈالیں۔ مجھے اس کے اس عمل پر بہت غصہ آیا لیکن جب بھی میں یہ نہیں سمجھی کہ شمس علی مجھ پر شک کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں تو بس اتنی بات تھی کہ شمس علی کی غیرت اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کسی کی مدد لینا گوارا نہیں کرتی۔ اصل بات تو مجھے اس قیامت کے روز سمجھ آئی جب میں دو دن کے شدید بخار کے بعد چارپائی پر پڑی تھی۔ اس روز معظم میری طبیعت معلوم کرنے ہمارے گھر آئے۔ اتفاق سے شمس علی اور میرے دونوں بیٹے گھر سے باہر تھے۔ معظم کے آنے کے بعد میں نے منہ ہاتھ دھونے کے خیال سے چارپائی سے اٹھ کر غسل خانے تک جانا چاہا پر کمزوری اتنی تھی کہ پہلے ہی قدم پر لڑکھڑا گئی۔ اس وقت تنہا معظم ہی کمرے میں تھے۔ انہوں نے مجھے سنبھالا اور اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ شمس علی اسی وقت دونوں بیٹوں کے ساتھ گھر آ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر اس کے شک زدہ ذہن نے نہ جانے کیا مطلب نکالا کہ اس نے مجھے کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔ وہ کیسا اذیت بھرا وقت تھا میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔''

کنول اب بھی اس کے چہرے پر موجود کرب کے سائے دیکھ رہی تھی لیکن جو کچھ اسے سنایا جا رہا تھا وہ اتنا عجیب تھا کہ اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔ وہ خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی کہ بیس سال پہلے گزرنے والے سانحے پر جلتی اس عورت کو کوئی دلاسہ دے سکے۔ بس اس نے اتنا کیا کہ گلاس میں پانی نکال کر اسے پلا دیا۔ پانی پی کر اس نے دوبارہ اپنی

داستان چھیڑ دی۔ شاید وہ سب کچھ آج اور ابھی ہی بتا دینا چاہتی تھی۔

''شمس علی کے طلاق دیتے ہی میں بالکل سڑک پر آ گئی تھی۔ شہر بھر میں میرا کوئی عزیز نہیں تھا۔ ماں باپ انڈیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھے تھے جنہیں اگر خبر ہو بھی جاتی تو میری مدد کے لیے پاکستان آنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ ایسے وقت میں معظم نے مجھے سہارا دیا۔ میں کچھ دن ان کے ایک دوست کے گھر رہی۔ اس دوران معظم، شمس علی کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس نے ان کی کسی وضاحت پر یقین نہیں کیا۔ طلاق اس نے دے ہی دی تھی۔ کسی مسلک کے تحت مصالحت کی گنجائش نکالنے کی کوشش، شمس علی کے نہ ماننے کی وجہ سے بیکار گئی۔ اس وقت معظم نے مجھے اپنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود کو میری بربادی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ اپنے اس جرم کا مداوا انہوں نے اس طرح کیا کہ ہر ایک کی مخالفت مول لے کر مجھے اپنا نام دے دیا۔ میری عدت مکمل ہوتے ہی میرا ان کے دوست کے گھر پر ان سے نکاح ہو گیا۔ معظم کے اپنے گھر والوں نے اس نکاح کی سخت مخالفت کی۔ رسوائی، بدنامی، بددعائیں کیا کیا نہ تھا جو ان دنوں ہمارے حصے میں آیا لیکن معظم کا حوصلہ تھا جو وہ اپنے فیصلے سے پیچھے نہ ہٹے۔ مجھے لوگوں کے طعنوں سے بچانے کے لیے وہ مجھے لے کر کراچی سے لاہور شفٹ ہو گئے۔ بڑے شاہ صاحب کی مہربانی تھی کہ انہوں نے ناراضی کے باوجود معظم کو ان کے حق سے محروم نہیں کیا اور انہیں ان کا حصہ دے دیا۔ یوں معظم نے نئے سرے سے محنت شروع کی۔ یہ جس فیکٹری میں تم آج کام کر رہی ہو معظم کو ورثے میں نہیں ملی انہوں نے برسوں جدوجہد کرنے کے بعد اسے قائم کیا ہے اور ان حالات میں جبکہ کچھ بھی ان کے حق میں نہیں تھا۔ اپنے گھر والے ناتا توڑ چکے تھے۔ شہر نیا تھا اور ساتھی کی صورت میں مجھ جیسی عورت جسے اپنے لٹنے کا ماتم کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ طلاق ہوئی سو ہوئی، اصل صدمہ مجھے اپنے بیٹوں سے جدا ہونے کا تھا۔ شمس علی مجھے طلاق دینے کے بعد گھر بیچ کر بچوں کے ساتھ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا کہ پھر اس کا کوئی اتا پتا ہی نہ مل سکا۔ صدمے نے مجھے ادھ موا کر دیا۔ پھر چھ سال بعد مومو پیدا ہوئی۔ بجائے اس کے کہ میں اسے پا کر سنبھل جاتی میری حالت اور بگڑ گئی۔ مجھ پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ دیوانگی میں، میں نے دو ایک بار مومو کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔ ان حالات میں معظم نے بچی کو سنبھالنے کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی۔ میرا علاج بھی چلتا رہا۔ میں کافی حد تک ٹھیک بھی ہو گئی لیکن ڈپریشن کا مرض ہمیشہ رہا۔ میں مومو کو کبھی ماں جیسا پیار نہیں دے سکی۔ میری ہی وجہ سے معظم نے اسے ہمیشہ گھر سے دور رکھا کہ کہیں میرا رویہ اس کی شخصیت کو مسخ نہ کر دے حالانکہ وہ خود مومو سے بہت محبت کرتے ہیں۔ مومو کی دوری برداشت کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ میں ان سب باتوں کو سمجھتی ہوں لیکن بس جانے کیا ہوتا ہے کہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتی۔ بہت عرصہ ہوا میرے اندر جینے کی تمنا ختم ہو چکی ہے۔

''میری شدت سے خواہش ہے کہ میں معظم کی زندگی سے نکل کر انہیں آزاد کر دوں۔ اب لگتا ہے کہ اس خواہش کے پورے ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میرے بعد تم، معظم اور مومو، تینوں مل کر آرام سے رہنا۔ مومو کو وہ پیار دینا جو میں اسے نہیں دے سکی اور اسے بتانا کہ اس کی ماں اس سے بہت محبت کرتی تھی مگر حالات کے ہاتھوں اس بری طرح بکھری کہ پھر کبھی خود کو سنبھال ہی نہ پائی۔ اگر تم معظم کی زندگی میں شامل ہو گئیں تو ان کی زندگی بھر کے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔ میں مرتے مرتے اپنے ساتھ یہ اطمینان لے کر جاؤں گی کہ وہ شخص جس نے ہمیشہ مجھے صرف دیا، میری دعائیں اس کے حصے میں بھی خوشیاں لے آئیں۔ اگر تم نے معظم کا ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ وہ شخص جس نے اپنی پوری جوانی قربان کر دی، جس کی وجہ سے میری بول چال سے لے کر، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے تک ہر طرح کے معیار بدل گئے زندگی میں ایک خوشی کا تو حق رکھتا ہے۔ کیا تم معظم کو یہ خوشی دو گی کنول؟'' معظم کی بیوی حسینہ جو کبھی اسم بامسمیٰ ہوا کرتی تھی لیکن آج صرف نام کی حسینہ رہ گئی تھی بڑی آس سے کنول سے پوچھ رہی تھی۔ کنول اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں سمائی ہوئی بری طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ان کے درمیان مزید ایک بھی لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا تھا لیکن آنسوؤں کی زبان ہر ان کہی کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے کنول؟ جب سے فیکٹری سے واپس آئی ہو چپ چاپ لیٹی ہو۔ وہاں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟''

حسینہ سے ملاقات کے بعد کنول کا سارا دن اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو میں الجھا رہا تھا۔ کبھی اسے حسینہ کی دوربین نگاہی حیران کرتی جس نے محض دو ملاقاتوں میں اس کے اور معظم کے درمیان تعلق کی نوعیت کو بھانپ لیا تھا تو کبھی حسینہ کی درد

معظم کی دیران آنکھوں میں نمی سی آتی بھری داستان اس کی آنکھوں میں نمی سے آتی تھی مگر ساتھ ہی زندگی کا دکھ بھی وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ کیا تھا وہ اس کی عظمت نے بھی اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ کیا تھا وہ شخص؟ ایک عورت کو بے اماں ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنی خواہش، خوشی، حال، مستقبل سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کچھ آسان تو نہ ہوگا اپنے سے تیرہ سال بڑی ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنا جس کی بے قرار ممتا نے اسے رفاقت کا حق ادا کرنے کے لائق ہی نہیں چھوڑا تھا پھر اس پر طرہ یہ کہ اس عورت کا ساتھ معظم کو ہر دم اپنی اولین محبت کی یاد دلاتا رہا ہوگا۔ کنول جتنا ان سب باتوں کو سوچتی اس کا دل اتنا ہی دکھ سے بھر جاتا۔ فیکٹری سے گھر واپس آجانے کے باوجود وہ دکھ کی اس کیفیت سے نکل نہیں سکی تھی اور حسب معمول امی کا باورچی خانے میں ہاتھ بٹانے کے بجائے کمرے میں آکر لیٹ گئی تھی۔ اس کے اس خلاف معمول رویے پر ہی امی تشویش میں مبتلا ہو کر اس سے پوچھ گچھ کرنے اس کے پاس چلی آئی تھیں۔

''فیکٹری میں کوئی مسئلہ نہیں ہے امی! البتہ اپنے باس کی مسز کے بارے میں، میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ آج میں فیکٹری سے ہی انہیں دیکھنے ہاسپٹل چلی گئی تھی۔ وہاں ان کی حالت دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ وہ بہت شدید بیمار ہیں۔ خود ان کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہیں۔'' کنول نے بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ماں کے لیے جگہ بناتے ہوئے اداسی سے بتایا۔

''بس بیٹا! یہی زندگی ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی دکھ لگا ہوا ہے۔ کہیں روپے پیسے کی کمی تو کہیں رشتوں کی بے مہری۔ جو اس طرف سے آسودہ ہیں انہیں بیماری اور دوسری پریشانیاں گھیر لیتی ہیں۔ سمجھو ان دکھوں اور پریشانیوں کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ جب تک سانس ہے دکھ سکھ کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔'' ان کے لہجے میں زندگی بھر کا تجربہ بول رہا تھا۔

''میرے باس بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے زندگی کے سارے دکھ بہت اعلیٰ ظرفی سے برداشت کیے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان جیسے اچھے انسان کی زندگی میں بار بار یہ دکھ اور پریشانیاں کیوں چلی آتی ہیں!'' کنول کے لہجے میں الجھن تھی۔

''آزمائش ہمیشہ نیک اور اچھے لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اللہ نے انہیں اعلیٰ ظرف عطا کیا ہے تو پھر اس ظرف کی آزمائش بھی تو ہوگی۔ بہرحال یہ معاملات تمہارے دخل دینے یا اعتراض کرنے کی باتیں نہیں۔ ہر بندے کا اللہ سے اپنا تعلق ہوتا ہے اس تعلق کی بنیاد پر ہی اللہ اس کی دنیاوی اور آخروی زندگی کے لیے فیصلے کرتا ہے۔ ہم تم اگر کچھ کر سکتے ہیں تو وہ یہ کہ ان دونوں زندگیوں میں ان کی بھلائی کے لیے دعا کریں۔'' کنول قائل ہونے والے انداز میں اپنی امی کی باتیں سن رہی تھی۔

''کل ایسا کرنا کہ فیکٹری سے واپس آنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ہاسپٹل لے چلنا۔ میں بھی ان خاتون کی عیادت کر لوں گی۔ اب تم اٹھو اور منہ ہاتھ دھو کر بہن بھائی کے ساتھ بیٹھو۔ کھانا تقریباً تیار ہے تھوڑی دیر بعد کھا لیں گے پھر تم عشا کی نماز کے بعد خوب دل لگا کر اپنے باس کی بیگم کے لیے دعا کرنا۔ اس سے تمہیں بھی سکون ملے گا اور اللہ ان کے لیے بھی بہتری عطا فرمائے گا۔'' امی نے نصیحت کی جس پر عمل کرنے کے ارادے سے کنول نے بستر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

''آپ اندر چل کر مسز معظم سے ملیں امی! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' حسینہ کے کمرے کے دروازے پر رک کر کنول نے اپنی امی سے کہا اور پھر خود تیزی سے پلٹ کر شفاف برآمدہ عبور کرتی ہوئی اس حصے میں آگئی جہاں ہسپتال کے کاؤنٹر کے سامنے چند آرام دہ بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ امی کے ساتھ یہاں سے گزرتے ہوئے اس نے معظم کو ایک بینچ پر اس حالت میں بیٹھے دیکھا تھا کہ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر پشت کی دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ کنول نے معظم کے چہرے پر موجود پریشانی کے آثار دور سے ہی دیکھ لیے تھے اسی لیے امی کو اس کی طرف متوجہ کیے بغیر انہیں وہاں سے گزار کر سیدھی حسینہ کے کمرے تک لے آئی لیکن خود اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ معظم کو اس حال میں دیکھنے کے بعد ایک پل کے لیے بھی کہیں اور ٹھہر سکتی، اس لیے خود دروازے سے ہی واپس پلٹ گئی۔ معظم اب بھی اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔ کنول دھیرے سے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی معظم نے تیزی سے آنکھیں کھولیں شاید اس نے کنول کی اپنے قریب موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ کنول نے دیکھا کہ معظم کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

''سب ٹھیک تو ہے سر؟ آپ کی مسز......'' کنول نے دل میں ابھرتے اندیشے کا ادھورے جملے میں اظہار کیا۔

''وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔

رپورٹس کے مطابق اسے لنگ کینسر ہے وہ بھی بالکل آخری اسٹیج پر۔ میں دو دن سے مسلسل ڈاکٹروں کے پیچھے دوڑ رہا ہوں کئی ماہرین سے رابطہ کر چکا ہوں لیکن سب کا ایک ہی جواب ہے کہ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا بہت دیر ہوگئی ہے۔'' معظم دھیمی آواز میں اسے بتانے لگا۔ کنول کو لگا کسی نے اس کا دل مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ حسینہ معظم کے حوالے سے اسے بہت عزیز تھی۔ پھر اس سے کل ہونے والی ملاقات کے بعد تو وہ اس کے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ محبت اور ہمدردی محسوس کر رہی تھی اس پیاری عورت کے بارے میں اس دل دہلا دینے والے انکشاف نے کنول کو گنگ کر دیا تھا۔

''بہت زیادتی کی حسینہ نے میرے ساتھ۔ ہمارے تعلق کی نوعیت جیسی بھی تھی اسے کم از کم موموکے بارے میں تو سوچنا چاہیے تھا۔ کیا جواب دوں گا میں موموکو جب وہ مجھ سے پوچھے گی کہ اس کی مما اس حال تک کیسے پہنچیں؟ وہ تو یہی سمجھے گی ناں کہ میں نے اس کی ماں کا خیال نہیں رکھا اسے یہ کون بتائے گا کہ اس کی ماں کے دل میں جینے کی امنگ ہی نہیں تھی۔'' معظم بے حد اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ کنول کو یکدم احساس ہوا کہ اس وقت معظم کو کسی کے سہارے کی اشد ضرورت ہے اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ یہ وقت خود ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھنے کے بجائے معظم کو حوصلہ دینے کا تھا۔

''آپ غلط سوچ رہے ہیں سر! موموبہت سمجھدار لڑکی ہے وہ جانتی ہے کہ آپ کتنے محبت کرنے اور خیال رکھنے والے شخص ہیں وہ اپنی مما کی بیماری کے لیے کبھی بھی آپ کو بلیم نہیں کرے گی اور پھر ہم یہ سوچیں ہی کیوں کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹرز نے اگر جواب دے دیا ہے تو ہم بیرونِ ملک کسی اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس جدید ٹیکنالوجی اور یہاں سے بہتر علاج کی سہولتیں ہیں ممکن ہے وہاں کچھ بات بن جائے۔ پھر سب سے بڑھ کر تو آپ مسیحائی کر سکتے ہیں۔ آپ اگر اپنی مسز کو یقین دلائیں کہ آپ کو ان کی ضرورت ہے، آپ زندگی بھر انہیں اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کی زندگی کے لیے بجھ جانے والی امنگ ایک بار پھر زندہ ہو سکتی ہے۔'' کنول بہت خلوص سے معظم کو سمجھا رہی تھی۔ معظم نے تہِ دل سے اس چھوٹی سی لڑکی کے خلوص کو محسوس کیا جو ایک ایسی عورت کے لیے جس سے اس کا رقابت کا رشتہ بنتا تھا زندگی کی امید روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میرے لیے حسینہ کے دل میں زندگی کی امنگ پیدا کرنا ممکن نہیں اگر یہ بات میرے بس میں ہوتی تو وہ اس حال کو نہیں پہنچتی۔ مگر تم یہ بات نہیں سمجھ سکتیں۔ بہت کچھ ایسا ہے جو تم نہیں جانتیں۔'' معظم نے شکستہ لہجے میں کنول کی بات کا جواب دیا۔

''اگر میں کہوں کہ میں بہت کچھ جانتی ہوں تو پھر....؟'' کنول کے بے حد سنجیدہ لہجے پر معظم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ سچ ہے سر! میں آپ کے اور آپ کی مسز کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ انہوں نے کل ہی مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ آپ دونوں کا کوئی دکھ، کوئی پریشانی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ وہ سب جو اتنے دنوں میں آپ مجھے نہیں بتا سکے انہوں نے محض تیسری ملاقات میں مجھے بتا ڈالا صرف اس لیے کہ وہ آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔ انہیں آپ کی فکر ہے۔'' کنول، معظم کو کل ہاسپٹل میں حسینہ سے اپنی ملاقات کی ساری تفصیلات بتاتی چلی گئی۔ معظم آنکھوں میں حیرت لیے سب کچھ سنتا رہا۔

''یہ سب سن کر آپ کو یقین کرنا پڑے گا سر کہ وہ بھی آپ سے محبت کرتی ہیں بس حالات نے انہیں کبھی اس محبت کے اظہار کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے وہ آپ کے احسان کے بوجھ تلے اتنی دب گئیں کہ انہوں نے خود کو کبھی آپ کی محبت کا حقدار نہیں سمجھا۔ اسی ذہنی کشمکش میں نہ تو وہ کبھی آپ کو اپنی محبت دے سکیں اور نہ ہی کبھی آپ کی محبت میں اپنا حصہ مانگ سکیں لیکن انہیں جس طرح آپ کی فکر ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ انسان بنا محبت کے یوں کسی کو خوش دیکھنے کے لیے ہلکان نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایک بیوی جب اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت سے بانٹنے کے لیے تیار ہو تو سمجھ لیں وہ کس انتہا درجے کی محبت کرتی ہے اپنے شوہر سے کہ اپنی ذات کو بھی پس پشت ڈالنے کو تیار ہے۔'' کنول کی باتیں معظم کے دل میں ایک نیا عزم جگا رہی تھیں۔ وہ جو مایوس ہو چکا تھا ایک بار پھر حسینہ کی زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے اپنے ہتھیار سنبھالنے کو تیار ہو گیا۔

وہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے موجود ہونے کے باوجود پہلی نظر میں ایک دوسرے کو شناخت نہیں کر سکی تھیں۔ شناخت کے مرحلے میں درپیش آنے والی اس مشکل کی ایک وجہ تو وہ درمیانی بیس سال تھے جو ان کی آخری ملاقات سے اس حالیہ ملاقات کے درمیان حائل رہے تھے لیکن دوسری اور بڑی وجہ ان دونوں میں آنے والی واضح تبدیلیاں تھیں۔ یہ تبدیلیاں صرف ماہ و سال کے جب

نہیں تھیں۔ ان کے پیچھے وہ حالات بھی تھے جن سے وہ دونوں گزشتہ بیس سال میں گزری تھیں۔ ان میں سے ایک کو اگر غم اور ذہنی تناؤ نے بستر مرگ پر پہنچا دیا تھا تو دوسری کو غربت وافلاس اور بے سہارا پن نے اس حال کو پہنچا دیا تھا کہ وہ اپنی عمر کا پانچواں عشرہ مکمل ہونے میں چند سال باقی ہونے کے باوجود عمر رسیدہ نظر آتی تھی۔

''ناجیہ تم.......؟'' پہچان کا مرحلہ بستر پر دراز بڑی عمر کی عورت نے پہلے طے کیا تھا۔

''آپ......'' جواباً ناجیہ نام کی وہ عورت جو کنول کی ماں تھی، فقط یہی ایک لفظ اپنی زبان سے ادا کر سکی تھی۔ اور پھر بستر پر اٹھ بیٹھنے والی حسینہ کی کھلی بانہوں میں جا سمائی تھی۔ حسینہ، ناجیہ کو بے تحاشا چومتے ہوئے زار وقطار رو رہی تھی۔

''آپ مجھے معاف کر دیں۔ میری محبت میں آپ کو بہت دکھ اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔'' ناجیہ نے روتے ہوئے برسوں سے سینے پر دھرا بوجھ اتارا۔

''معافی کیسی؟ جو کچھ ہوا اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا بلکہ شاید کسی کا بھی قصور نہیں تھا۔ ساری خرابی تو میری تقدیر کی تھی۔ میری خراب تقدیر نے اوروں کی بھی قسمت بگاڑ دی۔'' حسینہ کی آواز میں برسوں کی تھکن تھی۔

''مگر میں ہمیشہ خود کو آپ کا مجرم سمجھتی رہی۔ میری تقدیر سنوارنے کی کوشش میں ہی تو، آپ ابا کے عتاب کا نشانہ بنیں۔ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ مجھے ابا کو سچ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پھر جب آپ کے چھوٹے شاہ صاحب سے نکاح کی خبر ملی تو مجھے احساس ہوا کہ اب کسی بھی طرح کی صفائی دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نکاح کی خبر نے ابا کے شک کو اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ وہ مکان کا سودا پہلے ہی کر چکے تھے۔ ہم لوگ ان کی خواہش پر کراچی چھوڑ کر سکھر چلے گئے۔ بس پھر اس کے بعد ہمیں آپ کے بارے میں کبھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔'' جذبات کا چڑھا دریا کچھ اتر گیا تھا اور ناجیہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر قدرے پُرسکون لہجے میں حسینہ کے سامنے وضاحتیں پیش کر رہی تھی۔

''ان سب باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ میرے انور اور اظہر کیسے ہیں؟ اب تو وہ دونوں بہت بڑے ہو گئے ہوں گے۔ شادیاں ہو گئیں ان دونوں کی یا نہیں؟'' وقت اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ حسینہ کے لیے یہ ساری وضاحتیں بے معنی تھیں البتہ اس کی تڑپتی ہوئی ممتا کو اپنے بچھڑ جانے والے بیٹوں کا حال جاننے کی آج بھی روزِ اول جیسی ہی بے قراری تھی۔

''وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ دونوں کی شادی ہو گئی ہے۔ انور ملک سے باہر ہے، اظہر یہیں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ دونوں ماشاءاللہ خوش ہیں۔'' ناجیہ نے حسینہ کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

''دونوں مجھے یاد تو کرتے ہوں گے؟'' حسینہ نے آس سے ناجیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ نظر چرا گئی۔ کیا بتاتی کہ وہ دونوں تو ماں کا نام بھی بھولے سے بھی زبان پر لانے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اور جو کچھ بعد میں شمس علی نے انہیں باور کروایا تھا اس کے بعد ان کے دلوں میں ماں کے لیے نفرت کے سوا کوئی جذبہ نہیں رہا تھا۔ ناجیہ کے نظر چرا لینے سے حسینہ نے صورتحال کو سمجھ لیا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تمہاری شادی کب ہوئی؟ کتنے بچے ہیں؟ اور یہ تم وقت سے پہلے ہی اتنی بوڑھی کیوں لگنے لگی ہو؟''

''میری شادی تو ابا نے سکھر پہنچتے ہی فوراً کر دی تھی۔ میرا شوہر ایک سبزی فروش تھا جس کی عمر مجھ سے بہت زیادہ تھی۔ مگر بہرحال اس نے اپنی حیثیت کے مطابق مجھے زندگی کی ساری خوشیاں دینے کی کوشش کی۔ ابا اور انور، اظہر کو بھی اپنے ساتھ ہی گھر میں رکھا۔ ابا کا میری شادی کے پانچ سال بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ پھر انور کے میٹرک کرنے کے بعد ہم اس کے اصرار پر سکھر سے یہاں لاہور آ گئے۔ یہاں پر بھی میرے شوہر نے سبزی کی دکان کھول لی۔ ہمارا گزارا اچھا ہو جاتا تھا۔ میں اپنے تینوں بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی تھی مگر پھر میرے شوہر کو دمے کا مرض ہو گیا اور اس مرض نے اس کی جان لے لی۔ انور، اظہر نے اپنے طور پر کچھ دن ہماری مدد کی مگر زندگی بھر کون کسی کو بھرتا ہے۔ انور کا دبئی میں اپنا گھر بار بیوی بچے ہیں، اظہر کی بھی میں نے شادی کروا دی تھی وہ اپنے بیوی بچوں کے مسئلوں میں الجھ گیا۔ مجھے سلائی کا کام تو آتا ہی تھا بس اسی ہنر کے سہارے گھر چلتا رہا مگر اس مشقت اور بے سہارا پن نے میری صحت کو کھا لیا۔ شکر ہے مالک کا کہ بڑی والی بچی قابل نکلی۔ آج کل اسی نے گھر کا خرچہ سنبھالا ہوا ہے۔ اسی کی وجہ سے تو آج میں یہاں پہنچی ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے باس کی مسز بیمار ہیں انہیں دیکھنے اسپتال جانا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں آپ سے سامنا ہو جائے گا۔'' ناجیہ نے مختصراً اپنے حالاتِ زندگی سنائے اور پھر یکدم چونکی۔

''اس کا مطلب ہے کہ چھوٹے شاہ صاحب ہی میری بچی کے باس ہیں۔''

"تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے؟" ناجیہ کے خیال کی تصدیق کرنے کے بجائے حسینہ نے بے قراری سے سوال کیا۔

"کنول، کنول منیر ہے میری بیٹی کا نام۔ آپ تو جانتی ہوں گی اسے!" ناجیہ کے جواب نے حسینہ کے بدترین خدشے کی تصدیق کردی۔ وہ یکدم ہی نڈھال ہوکر بستر پر گرسی گئی۔

"کیا ہوا؟" "کیا طبیعت زیادہ خراب ہورہی ہے؟ میں ڈاکٹرز کو بلواؤں؟" ناجیہ اس پر جھک کر گھبرائی گھبرائی سی پوچھنے لگی۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ معظم ایک بار پھر خوشی سے محروم ہوجائے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔" ناجیہ کو کوئی جواب دینے کے بجائے حسینہ بے خودی کے عالم میں بڑبڑا رہی تھی۔

"ہیلو میم! کیا حال ہے آپ کا؟ کب تک بستر چھوڑنے کا ارادہ ہے؟" ناجیہ، حسینہ کی بڑبڑاہٹ سے کوئی نتیجہ اخذ کرتی اس سے قبل ہی کنول چہکتی آواز میں بولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"میری امی سے تو آپ مل ہی لی ہوں گی میم! میں اصل میں باہر سر سے کچھ بات کرنے کے لیے رک گئی تھی وہ کسی کام سے گئے ہیں تو میں یہاں آئی ہوں۔" کنول، خود ہی بولتی جارہی تھی۔ حسینہ کی طرف سے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا جارہا تھا۔

"کنول! تم ڈاکٹرز کو بلاؤ۔ مجھے لگتا ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ناجیہ نے کنول سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس کچھ دیر اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔" کنول کے حرکت میں آنے سے قبل ہی حسینہ بول پڑی۔ اس کی بات کا واضح طور پر یہ مطلب تھا کہ ناجیہ اور کنول کو اب وہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ دونوں کچھ دیر تذبذب کا شکار وہاں کھڑی رہنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اسپتال سے روانہ ہونے سے قبل کنول ڈیوٹی نرس کو حسینہ کے کمرے میں بھیجنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

"سنبل! مجھے ڈائری میں سے انور ماموں کا فون نمبر لکھ کردے دو۔ مجھے انہیں فون کرنا ہے۔" گھر واپس جانے کے بعد ناجیہ نے چھوٹی بیٹی کو حکم دیا تو کنول چونک گئی۔ حسینہ سے ملاقات کے بعد اسے ماں کھوئی کھوئی سی نظر آرہی تھی۔ کنول کو خیال گزرا کہ حسینہ نے امی سے اس کے اور معظم شاہ کے حوالے سے کوئی تذکرہ کیا ہے جب ہی وہ اس قدر الجھی ہوئی نظر آرہی ہیں مگر ایسی صورت میں تو انہیں سب سے پہلے کنول سے بات کرنی چاہیے تھی انور ماموں کو فون کرنے کی تو کوئی تک ہی نہیں بنتی تھی۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی۔

"انور ماموں کو فون کیوں کررہی ہیں؟" اندر کی بے چینی نے اسے ماں سے سوال کرنے پر مجبور کیا۔

"کیوں؟ کوئی پابندی ہے کیا؟ میرا بھائی ہے جب چاہے اس سے بات کرسکتی ہوں۔" ناجیہ بچوں کے سامنے ماضی کے معاملات نہیں کھولنا چاہتی تھی اس لیے قدرے جارحانہ رویہ اختیار کرکے کنول کو زبان بندی پر مجبور کردیا۔ اس دوران سنبل ایک کاغذ پر انور کا فون نمبر لکھ لائی تھی۔

"دروازہ بند کرلو اور ہاں تم لوگ کھانا کھالینا مجھے واپسی میں دیر ہوجائے گی۔ انور کو فون کرنے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے اظہر کے گھر بھی جاؤں گی۔" چادر سر پر جما کر باہر نکلتے ہوئے ناجیہ نے ہدایت دی۔ کنول کے چہرے پر نظر آنے والے سوالوں اور الجھن کو اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کردیا تھا۔ اس وقت اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اس عورت کے لیے کچھ کرسکے جس نے ماضی میں اس پر بہت احسانات کیے تھے آج وہ عورت بستر مرگ پر پڑی تھی اور ناجیہ اس کے لیے کچھ نہ سہی مگر اتنا تو کرسکتی تھی کہ اس کی تڑپتی ہوئی ممتا کو سکون پہنچانے کی کوشش کرسکے۔ اسی مقصد کے لیے وہ انور کو فون کرنے جارہی تھی۔

گھر سے کچھ فاصلے پر موجود پی سی او پر پہنچ کر اس نے وہاں ملازم لڑکے کو انور کا دبئی کا فون نمبر دیا۔ کال ملنے کے لیے اسے بیس منٹ تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ بیس منٹ بعد اس نے لائن پر انور کی آواز سنی۔

"انور! آج میری اماں سے ملاقات ہوئی تھی۔" رسمی علیک سلیک اور خیر خیریت معلوم کرنے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ناجیہ نے آہستہ سے انور کو بتایا۔

"کون اماں؟ ہماری کوئی ماں نہیں ہے اور تمہاری ماں کو مرے ہوئے بہت سال گزر گئے۔" انور جو پہلے ہی ناجیہ کے فون کرنے پر تھوڑا حیران تھا اس کی بات سن کر بالکل کٹھور بن گیا۔

"نظر چرانے سے حقیقت بدل نہیں جاتی انور! تم مانو یا نہ مانو لیکن یہ سچ ہے کہ اس زمین پر ایک عورت ایسی ہے جو تمہیں اس دنیا میں لانے کا سبب ہے اور تم اس کے وجود سے انکار نہیں کرسکتے۔"

"میں مانتا ہوں کہ ایک عورت مجھے اس دنیا میں لانے

کی ذمے دار ہے لیکن میں ایسی عورت کو اپنی ماں نہیں مان سکتا۔ وہ اس لائق ہی نہیں کہ اسے اس مقدس رشتے سے پکارا جائے۔''

انور کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''وہ مر رہی ہے انور! اس کی ویران آنکھیں تمہیں اور اظہر کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔'' ناجیہ نے انور کے اندر حسینہ کے لیے ہمدردی جگانے کی کوشش کی۔

''ہمارے لیے وہ بہت سال پہلے ہی مر چکی ہے مگر مجھے تم پر حیرت ہے آپا کہ تم ساری حقیقت جاننے کے باوجود کیسے اس عورت کی حمایتی بن بیٹھی ہو؟'' انور کے لہجے میں درد تھا۔

''میں ساری حقیقت جانتی ہوں تب ہی تو ان کی طرف داری کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ انہیں جس قصور کی سزا ساری زندگی ملتی رہی انہوں نے وہ جرم کیا ہی نہیں تھا۔'' ناجیہ نے انور کو سچائی بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیسی سزا؟ غربت کی زندگی کو اولاد سمیت ٹھکرا کر ایک عیش بھری زندگی گزارنے والوں کو بھلا کیا معلوم کہ سزا کیا ہوتی ہے؟ سزا تو ہم نے بھگتی ہے۔ ساری زندگی۔ بدنام ہوئے، در بدر پھرے۔ بچپن کی خوبصورتیاں کھو کر محنت اور مشقت کی چکی میں پسے۔ کیا جرم تھا ہمارا؟ صرف یہی نا کہ ہم نے ایک ایسی عورت کے بطن سے جنم لیا جو بدکردار تھی۔'' انور کے لہجے میں زہر کی سی تلخی تھی۔

''نہیں ہے وہ بدکردار عورت۔ کبھی کوئی جرم نہیں کیا اس نے۔'' انور کی بات سن کر ناجیہ چیخ پڑی لیکن لائن بے جان تھی۔ انور نے اس کی مزید بات سننے سے قبل سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ ناجیہ نے مرے مرے ہاتھوں سے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور کالر کو پرائیویسی فراہم کرنے کے لیے بنائے گئے کیبن سے باہر نکل کر باہر موجود لڑکے کو اس طویل کال کی ادائیگی کی۔ اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو وہ کیبن سے باہر آنے سے پہلے ہی اپنی چادر کے پلو سے صاف کر چکی تھی۔ اب اس کی اگلی منزل اظہر کا گھر تھا۔ اظہر کے گھر پہنچ کر اس نے اتنا انتظار کیا کہ اسے اظہر سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل سکے۔ اظہر کی بیوی باورچی خانے میں گئی تب اسے یہ موقع ملا۔ انور کی طرح اظہر بھی اس کی بات سن کر بھتے سے اکھڑ گیا۔ انور کی نسبت وہ مزاجاً بھی قدرے تیز تھا اس لیے ناجیہ کو اسے دلائل کے ذریعے قائل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ اظہر کے گھر سے واپس لوٹی بہت دلگرفتہ تھی لیکن اس نے سوچ رکھا تھا کہ ایک بار پھر دونوں بھائیوں کو قائل کرنے کی کوشش ضرور کرے گی۔

☆☆☆

''امی! باہر دروازے پر ایک گاڑی کھڑی ہے۔ ڈرائیور کہتا ہے آپ سے بات کرنی ہے۔'' ناجیہ باورچی خانہ سمیٹنے کے بعد دوپہر کا کھانا چڑھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ سنبل نے اسے اطلاع دی۔ ناجیہ باورچی خانے سے نکل کر حیران سی بیرونی دروازے پر پہنچی۔ واقعی وہاں ایک شاندار گاڑی اور باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ ''آپ ہی ناجیہ بیگم ہیں؟'' ناجیہ کو دروازے پر دیکھ کر ڈرائیور نے پوچھا۔

''مجھے مسز معظم نے بھیجا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ لے کر ہاسپٹل آ جاؤں۔'' ناجیہ کی طرف سے تصدیق ہونے پر ڈرائیور نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''تم ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' ناجیہ ڈرائیور کو جواب دے کر اندر آ گئی اور جلدی جلدی ہاسپٹل جانے کی تیاری کرنے لگی۔

''تم دوپہر کے کھانے کے لیے تھوڑی سی کھچڑی بنا لینا۔ شام کے لیے میں واپس آ کر خود ہی کچھ کر لوں گی۔'' چادر اوڑھ کر باہر نکلتے ہوئے اس نے سنبل سے کہا اور گاڑی میں جا بیٹھی۔ گھر سے ہاسپٹل تک کا سارا راستہ اس نے حسینہ کے بلاوے کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا۔ یقیناً برسوں بعد اپنے بچوں سے ملنے کی آس نے اسے بے چین کر دیا ہوگا اسی لیے اس نے ناجیہ کو بلایا تھا کہ ناجیہ ہی وہ واحد ہستی تھی جو اس کام میں اس کی مدد کر سکتی تھی۔

''مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔'' ہاسپٹل پہنچ کر جیسے ہی ناجیہ، حسینہ کے کمرے میں داخل ہوئی حسینہ نے مسکراتے لبوں سے یہ جملہ ادا کیا۔ ناجیہ دیکھ سکتی تھی کہ حسینہ کی مسکراہٹ بھی بے حد نقاہت زدہ تھی۔

''میں کیسے نہیں آتی۔ ایک میں ہی تو ہوں جو آپ کا درد صحیح معنوں میں سمجھ سکتی ہوں۔'' ناجیہ نے حسینہ کا ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''تمہیں اس طرح اچانک بلائے جانے پر زحمت تو ہوئی ہوگی لیکن میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس وقت کا انتخاب کیا ہے۔ اس وقت معظم فیکٹری گئے ہوئے ہیں اور میری خواہش تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں تم سے ملاقات کروں۔ فی الحال تمہارا اور ان کا سامنا ہونا مناسب نہیں۔'' حسینہ نے معذرت خواہانہ انداز میں ناجیہ کو یوں اچانک بلائے جانے کی وضاحت دی۔

"آپ فکر مت کریں مجھے بالکل بھی زحمت نہیں ہوئی۔ رہی چھوٹے شاہ صاحب سے سامنا ہونے کی بات تو مجھے اس کی فکر نہیں۔ گزرے بیس سالوں میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ نوعمری کے ان جذبات کا اب دل میں نام و نشان بھی نہیں رہا اور مجھے یقین ہے کہ یہی حال چھوٹے شاہ صاحب کا ہوگا۔ کچی عمر میں دل میں ابھرنے والے جذبوں کے رنگ بھی کچے ہی ہوتے ہیں جو زیادہ دیر ٹھہر نہیں پاتے۔" ناجیہ کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ حسینہ کس پریشانی میں مبتلا ہے۔

"مجھے معلوم ہے کہ گزرے وقت نے بہت کچھ بدل دیا ہے اور نوعمری کی وہ بات تمہارے اور معظم دونوں ہی کے دلوں سے مٹ چکی ہے۔ اس بات کی وجہ سے میں نے احتیاط کا راستہ اختیار بھی نہیں کیا۔ اس احتیاط پسندی کے پیچھے تو نئے حالات اور واقعات ہیں اور ان حالات کی گمبھیرتا ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اتنی زیادہ کہ مجھے کوئی حل بھی نہیں سوجھ رہا لیکن میں بس ایک بات جانتی ہوں، مجھے معظم کو ان کے حصے کی خوشی دلانی ہے اور انہیں یہ خوشی دینا تمہارے تعاون کے بغیر ممکن نہیں اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔" حسینہ کیا سمجھانا چاہ رہی ہے، ناجیہ کے لیے یہ سمجھنا آسان نہیں تھا۔ وہ وضاحت طلب نظروں سے حسینہ کو دیکھنے لگی۔

"حالات نے عجیب ہی موڑ لیا ہے۔ میں موت کی دہلیز پر کھڑی ہوں اور ایسے موقع پر محبت نے ایک بار پھر معظم کے دل پر دستک دی ہے۔ معظم کی زندگی میں آنے والی یہ تبدیلی کل سے پہلے میرے لیے بے حد خوش کن تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ میرے ساتھ گزرے ویران اور تھکا دینے والے سالوں کے بعد زندگی ان کے لیے ایک بڑی خوشی لے کر آنے والی ہے لیکن کل تمہیں کنول کی ماں کی حیثیت سے سامنے پا کر میرا سارا اطمینان رخصت ہو گیا ہے۔ مجھے لگا کہ معظم کی زندگی میں آنے والی خوشی کی راہ میں ایک بار پھر ایک بڑی رکاوٹ کھڑی ہو گئی ہے اور یہ رکاوٹ ایسی ہے کہ اسے دور کرنے کے لیے مجھے، تمہیں، معظم اور کنول سب کو غیر معمولی جرأت سے کام لینا ہوگا۔" حسینہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات کہہ رہی تھی پھر بھی اس کا سانس پھول گیا تھا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہی کہ آپ کس رکاوٹ کی بات کر رہی ہیں جو چھوٹے شاہ صاحب کی خوشی کے راستے میں کھڑی ہے اور جسے دور کرنے کے لیے ہم سب کو جرأت کرنی ہوگی۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ آپ نے مجھے انور اور اظہر سے ملنے کی خواہش میں یہاں بلایا ہوگا لیکن آپ جانے کون سا قصہ چھیڑے بیٹھی ہیں؟" ناجیہ کو حسینہ کی باتوں نے بری طرح الجھا دیا تھا۔

"انور اور اظہر میری اولاد ہیں۔ برسوں ان کی خاطر تڑپتے ہوئے گزارے ہیں میں نے لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ شمس علی نے میرے بیٹوں کے دل میں میرے لیے اتنا زہر بھر دیا ہوگا کہ وہ میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے اور موجودہ حالات میں تو میں خود بھی ان سے نہیں ملنا چاہتی۔ جہاں اتنے برس ان کے بغیر گزر گئے یہ آخری چند دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ مجھے تو اس وقت سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ معظم کے زندگی بھر کے احسانات کا قرض کسی طرح ادا ہو سکے۔ میں دنیا سے جاتے جاتے انہیں ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں لیکن اس تحفے کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔" ناجیہ نے دیکھا تھا کہ انور، اظہر کے ذکر پر حسینہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے لیکن اس نے کمالِ ضبط سے کام لیتے ہوئے ان آنسوؤں پر قابو پا لیا تھا۔

"وہ کیا تحفہ ہے جو آپ میری مدد کے بغیر چھوٹے شاہ صاحب کو نہیں دے سکتیں!" حسینہ کی کیفیت کے پیشِ نظر ناجیہ نے بہت محبت سے اس سے دریافت کیا۔

"کنول۔ تمہاری بیٹی کنول منیر۔" حسینہ کے جواب نے ناجیہ کو گنگ کر دیا۔

☆☆☆

"میں نے موموکو اس کے اسکول سے بلوا لیا ہے۔ اس کی اسٹڈیز ڈسٹرب تو ہوں گی لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ کچھ دن اپنی ماں کے قریب گزار لے۔ لندن کے ایک ہاسپٹل سے میں نے حسینہ کے علاج کے سلسلے میں رابطہ کیا ہے۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑی سی امید دلائی ہے ان لوگوں نے۔ میں حسینہ کو لندن لے جانے کے انتظامات کر رہا ہوں جب تک ہم لوگ روانہ نہیں ہو جاتے مومو یہاں رہ لے گی۔" معظم تھکے تھکے سے انداز میں کنول کو بتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اس کے رتجگوں اور پریشانی کی غماز تھی۔

"یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا سر! مومو کو سامنے پا کر میڈم کے اپنے اندر بھی زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہوگی۔ علاج کے لیے مریض کے اندر اس خواہش کا ہونا بہت ضروری ہے۔ رہا مومو کی اسٹڈیز کا مسئلہ تو میرے خیال میں وہ کافی ذہین لڑکی ہے تھوڑے بہت نقصان کو آسانی سے کور کر لے گی اور اگر نہ بھی کر سکی تو مجھے یقین ہے کہ اسے اس بات کا افسوس نہیں ہوگا۔ اولاد کے لیے ماں باپ کی زندگی کی

اہمیت اپنے کیریئر سے زیادہ ہوتی ہے۔'' کنول نے معظم کے فیصلے کو سراہتے ہوئے اسے تسلی بھی دی۔

''کل میں سارا دن بہت مصروف رہوں گا اس لیے موموکو ائرپورٹ لینے جانا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر تم ڈرائیور کے ساتھ اسے ائرپورٹ لینے چلی جاؤ تو مجھے تسلی رہے گی۔''

''آپ فکر نہ کریں سر! میں چلی جاؤں گی۔'' معظم کی بات سن کر کنول نے اسے یقین دہانی کروائی پھر خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

''مومومیڈم کے بارے میں جانتی ہے؟ آئی مین یہ کہ وہ اتنی شدید بیمار ہیں اور آپ انہیں علاج کے لیے لندن لے جانے والے ہیں؟''

''میں فون پر اسے یہ سب نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے اس کی چھٹی کے لیے اپلیکیشن بھجوانے کے ساتھ اس کی پرنسپل سے استدعا کی تھی کہ وہ موموکو صورتحال سے باخبر کردیں۔ اس کی پرنسپل ایک نہایت سمجھدار، ہمدرد اور معاملہ فہم خاتون ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ موموکو بہت مناسب لفظوں میں حالات سے آگاہ کردیں گی۔'' معظم نے دھیمی آواز میں بتایا تو کنول گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ کوئی کتنے ہی مناسب الفاظ استعمال کرے کسی بیٹی کے لیے یہ سننا کہ اس کی ماں موت کی دہلیز پر کھڑی ہے کبھی بھی آسان نہیں ہوسکتا۔

''جن فائلز وغیرہ پر میرے دستخط لینا ضروری ہیں وہ لے آؤ تاکہ میں یہاں سے نکل سکوں۔ مجھے لندن روانگی کے سلسلے میں ابھی بہت کام کرنا ہے۔'' معظم نے یکدم ہی گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کنول کو حکم دیا تو وہ چونکی۔

''اہم فائلیں میں نے پہلے ہی آپ کی ٹیبل پر رکھ دی ہیں۔ آپ انہیں دیکھ لیں۔ اس دوران میں آپ کے لیے کھانا لگواتی ہوں۔'' کنول کہتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''کھانا رہنے دو۔ میرا موڈ نہیں ہے کچھ بھی کھانے کا۔'' معظم نے اسے منع کیا۔

''موڈ ہے یا نہیں کھانا تو آپ کو کھانا ہوگا کیونکہ کھانے کے بغیر آپ کے اندر کام کے لیے توانائی پیدا نہیں ہوسکتی اور آدمی جب خود ہی ناتواں ہو تو دوسرے کے لیے کیا کرسکتا ہے۔''

کنول استحقاق سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ معظم کے فارغ ہونے تک وہ پیون کی مدد سے ٹیبل پر کھانا لگوا چکی تھی۔

''تم بھی آجاؤ۔'' معظم نے اسے پکارا تو وہ چپ چاپ اس کے ساتھ کھانے میں شامل ہوگئی لیکن خود کھانے سے زیادہ اس کا زور معظم کو کھلانے پر تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر معظم کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈالتی جارہی تھی۔ معظم جس نے کئی دنوں سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تھا خواہش محسوس نہ کرنے کے باوجود بھی اچھا خاصا کھا گیا۔ دراصل جسم کو تو بھرپور خوراک کی ضرورت تھی لیکن اپنی پریشانیوں میں الجھا وہ اس ضرورت کو مسلسل ٹالتا آرہا تھا اب جو کنول نے توجہ دی تو اسے پتا بھی نہیں چلا اور اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا۔

''تھینک یو کنول۔'' کھانے کے بعد پیون سبز چائے سرو کرکے گیا تو اس وقت معظم نے ممنون نظروں سے کنول کو دیکھتے ہوئے یہ دو لفظ ادا کیے۔

''کیا آپ کے اور میرے درمیان اس طرح کے الفاظ کی ادائیگی کی گنجائش نکلتی ہے؟'' کنول نے قدرے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات کہی تو اس کے اپنائیت بھرے انداز پر معظم کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی اللہ کی طرف سے اس کے لیے ایک خاص تحفہ ہے جس کا سامنے ہونا ہی دل کو بہت سکون دیتا ہے۔

☆☆☆

''سر کو چند بہت ضروری کام نمٹانے تھے اس لیے وہ خود تمہیں ریسیو کرنے نہیں آسکے اور مجھے بھیج دیا۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے پاپا کی مجبوری کو سمجھ لوگی۔'' ائرپورٹ پر موموکو ریسیو کرتے ہوئے اس کی متلاشی نگاہوں کے جواب میں کنول نے یہ بات کہی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں مس کنول۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اتنے سالوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ مجھے ریسیو کرنے نہ آئے ہوں اگر آج نہیں آسکے تو اس کا مطلب ہے وہ سچ مچ بہت بزی ہیں۔'' مومو نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور پارکنگ ایریا کی طرف قدم بڑھادیے۔ کنول اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

''کیا ہم یہاں سے سیدھے ہاسپٹل جائیں گے؟'' گاڑی ائرپورٹ کی حدود سے نکلی تو مومو نے کنول سے یہ سوال کیا۔

''نہیں۔ فی الحال ہم گھر جائیں گے۔ میڈم کے اس وقت کچھ ضروری ٹیسٹ وغیرہ ہونے ہیں اس لیے ہاسپٹل جانا بے کار ہے اگر ہم وہاں چلے بھی گئے تو ان سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ سر نے مجھے یہی ہدایت کی تھی کہ موموکو گھر لے جانا تاکہ وہ فریش ہونے کے بعد اپنی مما سے ملنے ہاسپٹل

آسکے۔'' کنول نے نرمی سے جواب دیا تو مومو نے قطعی انداز میں سر کو جنبش دے کر خاموشی اختیار کرلی۔ کنول کے لیے اس کا رویہ حیرت انگیز تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ مومو سیدھی ہاسپٹل جانے پر اصرار کرے گی اور اسے مومو کو قائل کرنے کے لیے کافی جدوجہد کرنی پڑے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری اور ضبط کا مظاہرہ کررہی تھی۔ شاید ضبط کا یہ ہنر اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ معظم شاہ کی شخصیت کا ٹھہراؤ دیکھ کر کبھی تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ شخص اپنی زندگی میں کن بڑے بڑے طوفانوں سے گزرتا رہا ہے۔ گھر تک کا سارا راستہ خاموشی میں گزرا۔ مومو گم صم تھی تو کنول کو بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا بات کرے۔

''تم فریش ہوکر آؤ۔ میں یہیں لاؤنج میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔'' ایک ملازم کے ذریعے مومو کا بیگ اس کے کمرے میں بھجوانے کے بعد کنول نے اس سے کہا تو اس نے دیگر باتوں کی طرح کنول کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بیس منٹ بعد مومو کمرے سے باہر نکلی تو کنول ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگوا چکی تھی۔

''آجاؤ مومو کھانا کھالو۔'' کنول اس کا ہاتھ تھام کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔

''پلیز مس کنول! میرا موڈ نہیں ہے۔'' مومو نے پہلی بار کنول کی کسی بات کو ماننے سے انکار کیا۔

''موڈ نہیں ہے تب بھی تھوڑا سا کھالو۔ تمہارے پاپا نے کک کو خاص طور پر تمہاری پسند کا کھانا بنانے کا حکم دیا تھا۔ انہیں پتا چلے گا کہ تم نے کھانا نہیں کھایا تو انہیں دکھ بھی ہوگا اور وہ پریشان بھی ہوں گے۔ پہلے ہی میڈم کی وجہ سے بہت پریشانی ہے کیا تم پسند کروگی کہ تمہاری وجہ سے ان کی پریشانی میں اضافہ ہو؟'' کنول نے اسے سمجھاتے ہوئے سوال کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے یکدم ہی رو پڑی۔ کنول نے دکھی دل کے ساتھ اسے گلے لگالیا۔ مومو کتنے ہی ضبط کا مظاہرہ کرتی...... تھی تو بہرحال ایک چھوٹی سی لڑکی۔

''میری مما ٹھیک ہوجائیں گی نا مس کنول؟''

''کیوں نہیں۔ اچھی امید رکھو اور اللہ سے دعا کرتی رہو۔ اللہ بڑا مہربان ہے وہی فیصلے کرتا ہے جو آدمی کے حق میں بہتر ہوتے ہیں۔'' مومو کے پوچھنے پر کنول نے اسے دلاسہ دیا پھر اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے سمجھانے لگی۔

''تمہیں بہت بہادری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ تم حوصلہ کروگی تو تمہارے مما اور پاپا کو بھی حوصلہ ملے گا۔ سر نے خاص طور پر تمہیں اس لیے یہاں بلوایا ہے کہ تمہیں دیکھ کر تمہاری مما کی دل میں جینے کی امنگ پیدا ہو۔ تمہیں چاہیے کہ ان کے لندن روانہ ہونے سے پہلے جتنے دن یہاں ان کے ساتھ رہو ان سے بہت اچھے موڈ میں بات کرو تاکہ انہیں احساس ہی نہ ہو کہ وہ اتنی زیادہ بیمار ہیں۔ مریض کے اچھے علاج کے لیے اچھے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اچھے تیماردار کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور تمہیں اپنی مما کے لیے بہت اچھی تیماردار بن کر دکھانا ہے۔'' کنول کی باتیں مومو کے اندر حوصلہ پیدا کررہی تھیں۔ جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور کنول کے دوبارہ کہنے پر اس کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھی۔ بہت رغبت سے نہ سہی پر اس نے تھوڑا بہت کھانا بھی کھالیا۔ کنول کے حساب سے اتنا بھی بہت تھا۔

☆☆☆

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں معظم!'' مختلف ٹیسٹوں کے تھکا دینے والے عمل سے گزرنے کے بعد حسینہ کو واپس کمرے میں پہنچایا گیا تو اس نے معظم سے خواہش ظاہر کی۔

''تم جو کہو میں سننے کے لیے تیار ہوں مگر بہتر ہے کہ ابھی کچھ دیر تم آرام کرلو۔'' معظم نے اس کی حالت کے پیشِ نظر مشورہ دیا۔

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی وقت کا کچھ معلوم نہیں جانے مجھے بعد میں آپ سے کچھ کہنے کی مہلت مل بھی سکے یا نہیں۔'' حسینہ نے جواب دیا۔

''ایسا کیوں سوچتی ہو؟ میں انتظامات کررہا ہوں جلد تمہیں لندن لے جاؤں گا۔ وہاں یہاں سے زیادہ علاج کی سہولتیں ہیں۔ تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔'' معظم نے اسے امید دلانی چاہی۔

''لندن والے کتنے ہی ترقی یافتہ سہی پر مہلت ختم ہونے پر زندگی بخش دینا تو ان کے اختیار میں بھی نہیں۔'' حسینہ کے ہونٹوں پر یاسیت بھری مسکراہٹ ابھری۔

''چھوڑو ان فضول باتوں کو اور وہ کہو جو تم مجھ سے کہنا چاہتی ہو۔'' معظم نے حسینہ کی آنکھوں میں بجھتی زندگی کی چمک سے نظر چراتے ہوئے اسے ٹوکا اور خود اس کے قریب بیٹھ کر اس کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''سب سے پہلے تو میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے آپ کی زندگی کے کئی بہترین سال ضائع ہوگئے اور بدلے میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے

سکی۔'' حسینہ کے لہجے میں حقیقی دکھ تھا۔
''مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ پھر تم نے مومو کی صورت میں مجھے جو خوشی دی ہے اس کو پا کر میرے دل میں اگر کوئی شکوہ تھا بھی تو وہ دور ہو گیا۔'' معظم نے نرمی سے اسے جواب دیا۔

''یہ تو آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ زندگی بھر کی تکلیفوں کے بعد بھی ایسی سوچ رکھتے ہیں لیکن میں خود اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتی کیونکہ میں نے ہمیشہ خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ میری سب سے بڑی خود غرضی تو آپ کی طرف سے نکاح کی پیشکش کو قبول کر لینا تھا۔ اس وقت میں نے صرف یہ سوچا کہ میں کہاں جاؤں گی۔ میرے ماں باپ اتنی دور تھے۔ نہ میرے پاس ان کے پاس جانے کے وسائل تھے اور نہ ہی میں طلاق یافتہ کی حیثیت سے ان کے سامنے جانے کا حوصلہ رکھتی تھی اس لیے میں نے اپنے مفاد کی خاطر آپ سے شادی کر لی۔ مگر میرا ذہن اس شادی کو کبھی قبول نہیں کر سکا۔ اپنے بچوں کی یاد نے مجھے کبھی ڈھنگ سے آپ کے گھر میں بسنے ہی نہیں دیا۔ اپنے غم میں چور مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ آپ نے کتنی مخالفتیں اور بدنامیاں مول لے کر مجھے تحفظ دیا ہے۔ میں نے تو آپ کی قربانی کے صلے میں اتنی بڑی زیادتی کی کہ اپنی ہی بچی کو اس کا حق نہیں دے سکی۔ وہ بیچاری ماں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی ممتا سے محروم رہی۔''
حسینہ کا گلا رندھ گیا تھا۔ عمر بھر کی غلطیاں آج پچھتاوا بنی اسے اعتراف پر مجبور کر رہی تھیں۔

''میں نے کہا ہے نا کہ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ پھر کیوں کرید رہی ہو ماضی کی ان تکلیف دہ باتوں کو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب آگے کے بارے میں سوچو۔'' معظم نے ایک بار پھر ہمدردی سے اسے ٹوکا۔
''آپ ٹھیک کہتے ہیں اب آگے کے بارے میں ہی سوچنا چاہیے اور سچ یہ ہے کہ میں کر بھی یہی رہی ہوں۔ میرے اپنے سامنے تو کوئی مستقبل نہیں مگر آپ کے اور مومو کے مستقبل کی مجھے بہت فکر تھی۔ کنول کو دیکھ کر مجھے لگا کہ یہ فکر بھی دور ہو گئی۔ وہ بہت سمجھدار لڑکی ہے۔ آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آپ کی خاطر مومو کا بھی بہت خیال رکھے گی۔'' حسینہ کہہ رہی تھی اور معظم آنکھیں پھاڑے اس کی بات سن رہا تھا۔

''حیران ہو رہے ہیں کہ مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا لیکن حیرانی کی کیا بات ہے بیس سال کے ساتھ میں اتنا تو آدمی ایک دوسرے کو سمجھ لیتا ہے۔ کنول کے آنے کے بعد

میں نے آپ کے چہرے پر جو رونق دیکھی وہ بیس سالوں میں کبھی مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں نے جان لیا کہ اس لڑکی کا آپ کے دل میں بڑا خاص مقام ہے اور یقین کریں مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ کو بھی حق ہے زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کا۔'' معظم کی حالت دیکھ کر حسینہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں یہ حق مجھے کوئی دے گا بھی یا نہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں اتنی چھوٹی ہے کہ میں خود شعوری طور پر اس کے بارے میں سوچنے سے گھبراتا ہوں۔ یہی خیال آتا ہے کہ اس کے گھر والے اور دیگر لوگ کیا سوچیں گے۔ دنیا طعنے دے گی کہ معظم شاہ نے اس عمر میں لڑکی پسند بھی کی تو خود سے تئیس چوبیس سال چھوٹی۔'' حسینہ کو ہمدرد پا کر معظم اس سے اپنی الجھن شیئر کرنے لگا۔

''دنیا والوں کی فکر نہ کریں۔ آدمی کو اصل فکر یہ ہونی چاہیے کہ اللہ کا قانون نہ ٹوٹے الحمدللہ آپ اور کنول کے رشتہ جڑنے میں شریعت کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی معاشرتی اصولوں سے آدمی بغاوت کر سکتا ہے اور میرے خیال میں جہاں دو انسانوں کی خوشی کا معاملہ ہو وہاں کسی کھوکھلے اصول کو توڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ آپ وعدہ کریں معظم کہ آپ دنیا کی خاطر خود کو خوشیوں سے محروم نہیں کریں گے۔ اپنی خاطر نہ سہی میری خاطر آپ کو کنول سے شادی کرنی ہوگی اور کچھ نہیں تو یہ سوچ کر کہ یہ ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش ہے۔'' حسینہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔

''تم اپنی زندگی سے مایوس نہ ہو حسینہ! تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' معظم نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

''مجھے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ مجھے صرف آپ سے یہ سننا ہے کہ حالات کتنے ہی ناموافق ہوں آپ کنول کو ضرور اپنائیں گے۔'' حسینہ اپنے مطالبے پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''میں اکیلا یہ وعدہ کیسے کر سکتا ہوں؟ یہ صرف میرے اختیار کی تو بات نہیں۔'' معظم بے بس سا ہو کر حسینہ کو اپنی مجبوری سمجھانے لگا۔

''آپ وعدہ کریں باقی ہر معاملہ میں خود دیکھ لوں گی۔'' حسینہ کا اصرار جاری رہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔'' بالآخر معظم نے ہتھیار ڈال دیے۔

''شکریہ معظم! اب جو کچھ ہو اسے یہ سوچ کر قبول کر لیجیے گا کہ میرے ہر عمل میں میرا بھرپور خلوص شامل ہے۔ زندگی میں بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں قبول کرنا انسان کے لیے بظاہر ناممکن ہوتا ہے لیکن ذرا سی جرات اور روشن خیالی ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔'' حسینہ کی یہ باتیں کن آنے والے حالات کے لیے باندھی گئی تمہید تھیں معظم نہیں جانتا تھا۔ یوں بھی اس کی توجہ حسینہ کی طرف سے ہٹ کر کنول کے ساتھ اندر داخل ہوتی مومو کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ وہ لپک کر بیٹی کو گلے لگانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

''یس کم ان۔'' دستک کے جواب میں مومو کی آواز سن کر کنول نے دروازے کی ناب گھمائی اور بے آواز دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

''اوہ آپ!'' کنول کو سامنے پا کر مومو کے منہ سے نکلا۔ ''جی جناب میں، آپ سنائیے کیا ہو رہا ہے؟ یہ اب تک بستر کیوں نہیں چھوڑا گیا؟'' کنول بے تکلفی سے مومو کے قریب ہی بیڈ پر جا بیٹھی۔

''بس، وہ رات کو نیند بہت دیر سے آئی تو صبح آنکھ نہیں کھل سکی۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی اٹھنے کا۔'' مومو نے کنول سے نظریں چرا کر لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ حالانکہ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اس تازگی کی بھی جھلک نہیں تھی جو بھرپور نیند لینے کے بعد جھلکتی ہے۔ اگر وہ سوئی بھی تھی تو بہت کم دورانیے کے لیے۔ کنول کی اس وقت یہاں آمد کی وجہ بھی مومو ہی تھی۔ ایک گھنٹہ قبل لنچ ٹائم میں اس نے آفس سے فون کر کے مومو کے بارے میں معلوم کیا تھا تو اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ مومو رات کو اپنے کمرے میں جانے کے بعد دوبارہ باہر نہیں نکلی۔ اس نے نہ ناشتا کیا تھا اور نہ ہی لنچ۔ ملازموں کی دستک کے جواب میں ہر بار ''ڈونٹ ڈسٹرب می'' کہہ کر انہیں واپس کر دیتی تھی۔ ملازم پریشان تھے۔ معظم شاہ علی الصباح گھر سے روانہ ہوتے وقت انہیں مومو کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گئے تھے لیکن مومو کسی کو لفٹ ہی نہیں کروا رہی تھی۔ صورتحال جاننے کے بعد کنول نے فوراً ہی مومو کے پاس آنے کا فیصلہ کیا اور یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ مومو نے اس کی دستک کے جواب میں اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتی تو کنول اندر ضرور جاتی۔ معظم شاہ کی بیٹی بھوکی پیاسی تنہا کمرے میں بند رہے یہ وہ کسی صورت بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

''تم نہا کر فریش ہونے کے بعد نیچے آجاؤ۔ میں اس دوران کچن کا جائزہ لیتی ہوں کہ کیا پکا ہے۔'' مومو کی حالت

پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر کنول نے نارمل انداز میں اس سے کہا اور بیڈ سے اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مومو نے بھی بستر چھوڑ دیا۔

''ویسے محترمہ آپ بتا دیں کہ کیا لینا پسند کریں گی، بریک فاسٹ یا لنچ تاکہ میں اسی کے مطابق ٹیبل سیٹ کروادوں۔'' کمرے سے نکلنے سے پہلے کنول نے مومو سے پوچھا۔

''دونوں کا مکسچر۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے کہ آپ مجھے کیا کھلاتی ہیں۔'' مومو نے بے ساختگی سے جواب دیا تو کنول مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچن میں آکر جائزہ لینے پر اسے اندازہ ہوا کہ کافی کچھ تیار تھا یقیناً معظم کی ہدایت پر مومو کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ کنول کا دل چاہا وہ خود اپنے ہاتھ سے مومو کے لیے کچھ بنائے۔ یہ بڑی بے ساختہ خواہش تھی۔ وہ خود سے چند سال چھوٹی مومو کے لیے دل میں ممتا کا جذبہ پھوٹتا محسوس کر رہی تھی اور ایسا یقیناً معظم کی وجہ سے تھا۔ وہ معظم کو اپنے دل میں جو مقام دے چکی تھی اس کے بعد مومو کے لیے ایسے جذبات محسوس کرنا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کے زیر اثر اس نے کچن کا جائزہ لیا۔ کک نے مٹن پلاؤ، شامی کباب اور قیمے پر مشتمل کھانا تیار کیا تھا اور اب کنول کی ہدایت پر ان چیزوں کو مائیکرو ویو میں گرم کرنے رکھ رہا تھا۔

''گوندھا ہوا آٹا ہے؟'' کنول نے کچھ سوچتے ہوئے کک سے استفسار کیا۔

''یس مس۔ اگر آپ کہیں تو میں ابھی تازہ پھلکے بنا دیتا ہوں لیکن بے بی رائس زیادہ شوق سے کھاتی ہیں۔'' کک نے مستعدی سے جواب دیا۔

''نہیں پھلکے بنانے کی ضرورت نہیں، بس مجھے فرج میں سے آٹا نکال دو۔'' کنول نے کک کو حکم دیا اور پھر خود قیمے کے برتن میں سے کچھ قیمہ علیحدہ کر کے اس کے ساتھ کارروائی کرنے لگی۔ کچھ اشیا کے اضافے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ قیمہ مطلوبہ شکل میں آ گیا ہے تو اس کے بعد اس نے چولہے پر توا رکھا اور آٹے کا پیڑا بنا کر اسے بیلنے لگی بیلی ہوئی روٹی پر گھی لگانے کے بعد اس نے اس میں قیمے کی فلنگ کی اور پھر اسے گرم توے پر ڈال دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب مومو کچن میں داخل ہو گئی۔

''اف! کیا زبردست خوشبو آ رہی ہے۔'' اپنی ناک سکیڑتے ہوئے مومو نے بے ساختہ ہی تبصرہ کیا تو کنول مسکرا دی لیکن توجہ پراٹھے پر ہی رکھی۔ بہت توجہ سے تیار کیا گیا سنہری اور خستہ پراٹھا ایک پلیٹ میں رکھ کر وہ کچن سے باہر نکلی تو مومو اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس دوران ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے دیگر لوازمات بھی سجائے جا چکے تھے۔

''میں تو بھئی آپ کے ہاتھ کا پراٹھا کھاؤں گی۔'' مومو نے ٹیبل پر موجود لوازمات پر ایک سرسری سے نگاہ ڈالنے کے بعد اعلان کیا اور پراٹھے والی پلیٹ اپنی جانب سرکالی۔

''آپ بھی لیجیے نا۔'' پراٹھے کا نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالنے سے قبل اس نے کنول سے کہا۔

''میں لنچ لے چکی ہوں۔'' کنول نے بتایا۔

''پھر بھی تھوڑا سا میری خاطر میرا ساتھ دینے کے لیے لے لیں۔'' مومو نے اصرار کیا۔ کنول نے اس کے اصرار کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اور پلیٹ میں تھوڑا سا پلاؤ اور ایک شامی کباب نکال لیا۔

''واہ، زبردست۔ بڑے مزے کا پراٹھا بنایا ہے آپ نے مس کنول۔ آپ تو امتحان میں سو میں سے سو نمبر لے کر

کامیاب ہو گئیں۔'' مومو نے پراٹھا کھاتے ہوئے ایک بار پھر تعریف سے بھرپور تبصرہ کیا۔

''تعریف کے لیے شکریہ۔ ویسے مجھے معلوم ہے یہ بہت زیادہ مزے کا نہیں ہوگا۔ مجھے بہت کم موقع ملتا ہے کچن میں جانے کا اس لیے میری کوکنگ کچھ خاص نہیں ہے یہ تو بس میں نے اس لیے بنادیا کہ میرا دل چاہ رہا تھا تمہیں اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلانے کا۔'' کنول نے پوری سچائی سے بتایا۔

''آپ بہت سویٹ ہیں مس کنول! مجھے تو آپ بالکل کسی فیملی ممبر کی طرح لگتی ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو کنول باجی کہہ کر پکارلیا کروں؟'' مومو نے بہت محبت سے کہتے ہوئے کنول سے اجازت چاہی۔

''جو تمہارا دل چاہے کہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن یہ پراٹھا جلدی سے ختم کرو مجھے معلوم ہے کہ تم نے کل رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا اور اب تو سہ پہر بھی ختم ہونے کو ہے۔'' کنول نے فراخ دلی سے اجازت دیتے ہوئے اس کی توجہ کھانے کی طرف مبذول کروائی۔ مومو نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ البتہ پراٹھے کے علاوہ اس نے کنول کے اصرار پر بھی کسی اور شے کو چکھنے کی زحمت نہیں کی۔ کھانے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر اٹھ کر مومو کے کمرے میں آگئیں۔ ملازمہ مومو کی ہدایت پر چائے وہیں لے آئی۔ ''پتا ہے کنول باجی! میرا بڑا دل چاہتا تھا کہ مما کبھی مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلائیں۔ آج آپ نے میرے لیے پراٹھا بنایا تو مجھے لگا میری برسوں کی خواہش پوری ہو گئی۔ کک کے ہاتھ سے بنے بے شمار کھانوں اور اچھے سے اچھے ریسٹورنٹ کی مہنگی ترین ڈشز میں مجھے کبھی وہ ذائقہ نہیں ملا جو آپ کے بنائے پراٹھے میں تھا۔ شاید ماں کے ہاتھ کا لمس اسی چیز کو کہتے ہیں جو عام سی شے کو بھی خاص بنادے۔'' مومو جو کہہ رہی تھی اسے سن کر کنول کے ہاتھ کپکپا گئے۔ اس کی حالت سے بے خبر مومو اپنی ہی کہہ رہی تھی۔

''میں مما کی محبت کو بہت ترسی ہوں۔ مجھے ہمیشہ ان سے یہ شکوہ بھی رہا ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتیں لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ میں غلط تھی۔ مما نے ہمیشہ مجھ سے بہت محبت کی ہے لیکن بس انہیں اس محبت کا اظہار نہیں کرنا آیا اور اب جبکہ مما نے محبت کا اظہار کرنا سیکھ لیا ہے تو ان کے پاس مہلت نہیں رہی۔'' مومو کی آواز یکدم رندھ گئی۔

''تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو مومو! تمہاری مما ٹھیک ہو جائیں گی۔ تمہارے پاپا کوشش کر تو رہے ہیں۔'' کنول نے مومو کو دلاسہ دینا چاہا جس پر اس کے ہونٹوں پر محض ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہی پھیل سکی۔ پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن ان کی محبت کے باوجود مجھے ہمیشہ ایک کمی کا احساس رہا۔ ممکن ہے میرے اس ننھیال اور ددھیال سے وابستہ رشتے ہوتے تو میں بہل جاتی لیکن یہ بھی میری بدقسمتی تھی کہ مائیگریشن کے وقت مما کی ساری فیملی ختم ہو گئی۔ پاپا نے انہیں سہارا دینے کے لیے ان سے شادی کی تو میرے ددھیال والے ان کی خود سے بڑی عمر کی عورت سے شادی کو قبول نہیں کر سکے۔''

مومو، کنول کو وہی کچھ بتا رہی تھی جو خود اسے بتایا گیا تھا۔

''تو کیا تمہارا اپنے ددھیال والوں سے بالکل بھی ملنا جلنا نہیں؟'' کنول نے تجسس سے پوچھا کہ معظم کی فیملی کے بارے میں تو وہ بھی جاننا چاہتی تھی۔

''ایک دو دفعہ تقریبات کے موقع پر پاپا مجھے اپنے ساتھ لے کر وہاں گئے تھے لیکن کسی نے مجھے بہت زیادہ امپورٹنس نہیں دی پھر پاپا نے مجھے مری بھجوادیا تو میرے پاس کہیں آنے جانے کا ٹائم ہی نہیں رہا۔'' مومو نے سادگی سے بتایا۔

''اور وہ لوگ خود... کیا وہ لوگ کبھی تمہارے گھر نہیں آئے؟'' کنول نے دریافت کیا۔

''دادی کا تو پاپا بتاتے ہیں ان کی شادی سے پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ دادا کی بھی دو سال پہلے ڈیتھ ہو گئی، دادا اپنی زندگی میں ایک بار آئے تھے لیکن مما کی ذہنی حالت کی وجہ سے خفا ہو کر دوبارہ نہیں آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاپا، مما کو چھوڑ کر دوسری شادی کرلیں لیکن پاپا راضی نہیں ہوئے۔ پاپا خود جاتے تھے ان سے ملنے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ پاپا کے اپنے بہن بھائیوں کے پاس بھی فرصت نہیں کہ وہ ان سے رابطہ کریں یا پھر شاید ناراضی لاتعلقی کی شکل اختیار کر گئی ہے۔''

مومو نے بتایا تو کنول سر ہلا کر رہ گئی وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی کہ نئی زمانہ جو افراتفری کا عالم ہے وہاں رشتوں کی اہمیت دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ خود اس نے اپنے ماموؤں کا رویہ دیکھا تھا۔ مومو کے ددھیال والے تو خیر بھی قریب ہی نہیں رہے تھے کہ دلوں میں قربت و محبت پیدا ہوتی مگر اس کے دونوں ماموں تو طویل عرصہ ساتھ رہنے کے بعد بیگانے ہو گئے تھے۔ اپنے بال بچوں میں کھو کر انہیں اس بہن اور اس کے بچوں کا خیال نہیں رہا تھا جس کے آنگن میں ان کی

اپنی پرورش ہوئی تھی۔

''کل آپ کے ہاسپٹل سے جانے کے بعد میں مما کے ساتھ بہت دیر تک ان کے روم میں رہی مما نے کل پہلی بار مجھ سے بہت باتیں کیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کے بعد کوئی ایسا ہو جو مجھے بالکل ان ہی جیسی محبت دے سکے۔ آپ جانتی ہیں کنول باجی انہوں نے اس سلسلے میں کس کا نام لیا؟'' مومو کے اس اچانک پوچھے گئے سوال پر کنول دم بخود سی بیٹھی رہ گئی حالانکہ اس سوال کا جواب وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ مومو اس کی طرف سے خاموشی پا کر خود ہی بتانے لگی۔

''انہوں نے مجھ سے آپ کا نام لیا۔ شروع میں ان کی بات سن کر مجھے بہت عجیب لگا لیکن پھر مما نے مجھے سمجھایا کہ آپ پاپا اور میرے لیے کتنی ضروری ہیں۔ خصوصاً پاپا کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔''

''شاید اسی وجہ سے تم رات بھر جاگتی اور روتی رہی ہو؟'' مومو کی بات سن کر کنول شرمندگی سے بولی۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے مما کی بات بہت اچھی طرح سمجھ لی ہے اور ان ہی کی طرح میں بھی چاہتی ہوں کہ اتنا سیکریفائس (Sacrifice) کرنے کے بعد پاپا کو ان کی خوشی حاصل کرنے کا حق دیا جائے۔ میری اداسی کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ میں مما کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ ان کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص کم سے کم وقت میں اپنے حصے کے سارے کام نمٹا لینا چاہتا ہو۔ ڈاکٹرز، پاپا، آپ یا میں کتنی ہی امید افزا بات کریں مما کے اپنے اندر امید کی کوئی کرن نہیں اور یہ بہت خطرناک بات ہے۔ بغیر امید کے آج تک میں نے کسی کو جیتے نہیں دیکھا۔'' اس بار مومو باوجود کوشش کے ضبط نہیں کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کنول دکھی دل سے اسے خود سے لگا کر چپ کروانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کوشش کے دوران خود اس کی اپنی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہ رہے تھے۔ مومو کو لاکھ تسلیاں دینے کے باوجود خود اس کے اپنے احساسات بھی وہی تھے جن کا اظہار ابھی مومو نے کیا تھا۔

☆☆☆

''یہ کیسے ممکن ہے؟ میں ذہنی طور پر اس بات پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں یوں بھی پرسوں ہمیں لندن کے لیے روانہ ہونا ہے ایسے میں اس طرح کا کوئی کام کیسے ممکن ہے؟'' معظم شاہ کے لہجے میں حیرت اور برہمی کی آمیزش تھی۔

''دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ یہاں پر وہ واقعہ وقوع پذیر ہو جاتا ہے جس کا انسان کو بھی گمان بھی نہیں گزرتا۔ رہی ذہنی طور پر تیار نہ ہونے کی بات تو اس سے فرق نہیں پڑتا میں جس معظم شاہ کو جانتی ہوں اس نے اس سے بھی بڑے فیصلے بلا جھجک، بنا کسی مہلت کے مخالفتوں کے طوفان میں کیے ہیں۔'' حسینہ کا لہجہ معظم کے برعکس بہت پرسکون تھا۔

''تم سمجھنے کی کوشش کرو حسینہ! یہ صرف میرے اور تمہارے درمیان کا معاملہ نہیں۔ کنول اور اس کے اہل خانہ کی رضامندی، مومو کو ذہنی طور پر تیار کرنا یہ سب بچوں کا کھیل نہیں جو ایک دن میں ہو جائے۔ پھر دنیا کیا کہے گی کہ معظم شاہ اپنی شدید بیمار بیوی کے علاج کی فکر کرنے کے بجائے اس عمر میں خود سے آدھی سے بھی کم عمر لڑکی سے شادی کی فکر میں مبتلا ہے۔'' معظم نے اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا لہجہ بدستور جھنجلایا ہوا تھا۔

''کنول کی والدہ سے میں نے اجازت لے لی ہے اور مومو کو بھی ذہنی طور پر تیار کر دیا ہے۔ اسے آپ کی اور کنول کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ باقی بچے دنیا والے تو ان کی زبانیں بند کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ میری خواہش ہے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا والوں میں اتنا قابل ذکر ہے ہی کون؟ میں تو سرے سے ہی تنہا ہوں اور آپ کے جو اپنے ہیں ان سے آپ کا رابطہ اتنا کم ہے کہ ان کے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں نکلتی۔'' حسینہ نے گویا معظم کے ہر اعتراض کو ختم کر دیا۔

پھر بھی ضروری نہیں کہ یہ سب اتنی عجلت میں ہو۔ لندن سے واپس آ کر بھی اس معاملے پر غور کیا جا سکتا ہے۔

معظم اب بھی پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔

''کسے معلوم ہے کہ جب آپ لندن سے واپس لوٹیں تو میں آپ کے ساتھ ہوں بھی یا نہیں؟ میری جو حالت ہے اس سے آپ بھی واقف ہیں ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہیں کہ جو کام کل ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے۔ کم از کم مرنے سے پہلے میری آخری خواہش تو پوری ہو جائے گی۔ پلیز معظم! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میری بات رد نہ کریں، میں دنیا سے جاتے ہوئے یہ اطمینان اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں کہ میری ذات سے آپ کو بھی کوئی فائدہ پہنچا۔ میں جو ساری زندگی آپ سے لیتی رہی جانے سے پہلے آپ کو کچھ دے سکی۔''

حسینہ نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ یہ سب کہتے ہوئے یکدم ہی معظم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی اس حرکت کے بعد معظم کو اپنے لیے کوئی جائے فرار دکھائی نہ دی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ معظم کی ذرا سی ہامی بھرنے کی دیر تھی سب کام خودکار انداز میں ہونے لگے۔ معظم کو اندازہ ہوا کہ اس کی طرف سے اجازت ملنے سے قبل ہی حسینہ سارے انتظامات کر چکی تھی۔ معظم کے سامنے اس نے صرف چند فون کالز کی تھیں۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ ڈاکٹر سے خصوصی اجازت لے کر اس نے ہاسپٹل سے چند گھنٹے کی چھٹی بھی لے لی تھی۔ شام سات بجے جب معظم اپنے دو تین دوستوں اور مومو پر مشتمل مختصر برات کے ساتھ کنول کے گھر روانہ ہوا تو حسینہ نے خود اس برات کو رخصت کیا۔ وہ خود کمزوری کے باعث برات کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ معظم روانگی سے قبل ملازمین اور حسینہ کے ساتھ آئی نرس کو اس کے بارے میں سخت تاکید کر کے گیا تھا اس کے باوجود کنول کے گھر پہنچ کر نکاح کی کارروائی میں بہت عجلت سے کام لیا تھا۔ کنول کے گھر پر بھی زیادہ لوگ نہیں تھے۔ رشتے داروں میں اس کے ماموں ممانی ہی نمایاں نظر آ رہے تھے جو کچھ ناگواری کے ساتھ براتیوں کی خاطر مدارت کرتے رہے تھے۔ نکاح کے فوراً بعد رخصتی عمل میں آ گئی تھی۔ اس وقت معظم نے کنول اور اس کی والدہ کو دیکھا تھا۔ کنول بھاری جوڑے اور زیورات سے لدی پھندی بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ یقیناً یہ سارا انتظام حسینہ نے کیا تھا۔ کنول کی والدہ کا لباس البتہ سادہ اور ہلکے رنگ کا تھا جس پر انہوں نے بڑی سی چادر اس انداز میں اوڑھ رکھی تھی کہ معظم کو ان کا چہرہ مکمل طور پر دکھائی نہیں دیا تھا۔

''آپ سے کنول کا نکاح میں نے اس بنیاد پر کیا ہے کہ اس رشتے کے ساتھ بہت سے لوگوں کی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں۔ میں اس یقین کے ساتھ اپنی بیٹی کو آپ کے ساتھ رخصت کر رہی ہوں کہ یہ آپ کو بہت خوش رکھے گی۔ آپ سے میں بس اتنی امید کرتی ہوں کہ جیسے اس رشتے کو جوڑتے وقت میں نے دنیا کی پروا نہیں کی آپ بھی دنیا داری کو بھول کر اس رشتے کو نبھائیں گے۔'' کنول کے معظم کے ساتھ گھر کی دہلیز عبور کرنے سے قبل اس کی والدہ نے دھیمے لہجے میں معظم سے یہ چند جملے کہے تھے۔

''آپ فکر نہ کریں، میں کنول کا ہر ممکن خیال رکھوں گا۔'' جواباً معظم نے انہیں یقین دہانی کروائی وہ سمجھ سکتا تھا کہ اپنی بیٹی کی اس غیر معمولی انداز میں شادی کرنے پر اس عورت کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ یہ حسینہ ہی کا کارنامہ تھا جو اس نے کنول کی والدہ کو راضی کر لیا تھا کس طرح اس بارے میں معظم قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا اور کنول کے گھریلو حالات کو دیکھتے ہوئے زیادہ امکان اس بات کا ہی تھا کہ حسینہ نے اس شادی کے بدلے اس کے خاندان کی مالی معاونت کی ہو۔ اگر ایسا تھا بھی تو معظم کو اعتراض نہیں تھا۔

کنول کے گھر سے وہ لوگ اس انداز میں رخصت ہوئے کہ گاڑی کی پچھلی نشست پر کنول، معظم اور مومو کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ مومو اپنی حرکات و سکنات اور گفتگو سے خوش نظر آ رہی تھی۔ معظم کو اس کی بہت فکر تھی۔ حسینہ کی طرف سے یقین دہانی کے باوجود اس نے نکاح سے پہلے خود بھی مومو سے بات کی تھی اور اس نے بہت باوقار انداز میں معظم کو بتایا تھا کہ اسے اس نکاح پر کوئی اعتراض نہیں۔ مومو کا وہ انداز دیکھ کر معظم کو شدت سے احساس ہوا تھا کہ حالات نے اس کی بیٹی کو وقت سے بہت پہلے سمجھدار بنا دیا ہے۔

''بڑی بیگم صاحبہ نے حکم دیا تھا کہ دلہن گھر آئے تو آپ کو اور دلہن کو آپ کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ کمرا انہوں نے تیار کروا دیا ہے۔'' دس بجے کے کچھ بعد وہ لوگ گھر پہنچے تو ملازموں نے پھولوں کی برسات کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور پھر ایک ملازم نے معظم کو یہ اطلاع دی۔

''وہ خود کہاں ہیں؟'' خلاف توقع حسینہ کو اپنے انتظار میں نہ پا کر معظم نے بے چینی سے ملازم سے پوچھا۔ معظم کے دوست راستے سے ہی رخصت ہو گئے تھے۔

''جی وہ کہہ رہی تھیں کہ تھک گئی ہیں اس لیے آرام کریں گی۔'' ملازم نے اطلاع دی تو معظم نے ناچار کنول

کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اسے احساس تھا کہ بھاری لباس اور زیورات کے ساتھ کنول کو یہاں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا ہوگا۔ کمرے میں پہنچ کر معظم اور کنول کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کمرا بے تحاشا پھولوں کے ساتھ بے حد خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ یقیناً یہ کام حسینہ نے برات کی روانگی کے بعد اس طرح کے کام انجام دینے والے کسی ادارے سے کروایا تھا۔ کمرے کی مہکتی فضا میں کھڑے ہو کر معظم نے پہلی بار اپنے دل میں اس عورت کے لیے شدت سے محبت محسوس کی جسے... اس نے بیس اکیس سال قبل محض ایک اخلاقی فریضے کے طور پر اپنایا تھا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔'' عجیب و غریب کیفیت میں گھرے معظم کو کنول کی آواز نے چونکایا وہ سوالیہ نظروں سے کنول کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ کی اور میڈم کی لندن روانگی سے قبل یہ جو دو راتیں باقی ہیں یہ میں میڈم کے ساتھ، ان کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں۔'' کنول نے جھجکتے ہوئے انداز میں جو فرمائش کی تھی اسے سن کر معظم دم بہ خود رہ گیا۔ اس کی زندگی میں دو عورتیں آئی تھیں اور دونوں ہی عجیب و غریب تھیں۔ ان دونوں کے درمیان جو نازک رشتہ تھا اس کے ساتھ لازم ملزوم سمجھے جانے والے روایتی رقیبانہ رویے کے برخلاف معظم انہیں محبت کی ڈور میں بندھا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی کنول کی بات سن کر اس کے دل میں کنول کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔ معظم کے ساتھ کی بہت شدت سے متمنی ہونے کے باوجود کنول نے اس مقام پر بے صبری سے کام نہیں لیا تھا اور نہ ہی معظم پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے برعکس وہ معظم کی بیمار بیوی کی خدمت کرنے کی خواہشمند تھی جبکہ اسے معلوم تھا کہ یہی دو راتیں ہیں جو شادی شدہ زندگی کا آغاز ہونے کے بعد اسے فوری طور پر معظم سے مل سکتی ہیں۔ اس کے بعد تو معظم، حسینہ کو لے کر ایک طویل مدت کے لیے لندن روانہ ہو جاتا۔ اپنی گداز ہوتی قلبی کیفیات کے ساتھ معظم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کنول کو اپنی رضامندی کا عندیہ دیا اور خود بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گیا۔ کنول اس کی طرف سے اجازت ملنے پر وارڈروب سے ایک سادہ سوٹ نکال کر ملحقہ غسلخانے میں چلی گئی۔ کنول کے سائز کی مناسبت سے وارڈروب میں لباس کی فراہمی کا انتظام بھی یقیناً حسینہ کے حکم پر کیا گیا تھا۔ مختصر وقت میں بھی اس نے چھوٹی سے چھوٹی بات کا دھیان رکھا تھا۔ کنول پانچ منٹ بعد ہی غسل خانے سے نکل آئی۔ زیورات اور بھاری دوپٹا وہ اندر جانے سے پہلے ہی اتار چکی تھی۔ غسل خانے میں اس نے محض لباس کی تبدیلی اور منہ دھو کر میک اپ سے نجات کے کام سرانجام دیے تھے۔ منہ دھو لینے کے باوجود میک اپ کے بچے کھچے اثرات اور چہرے کی مخصوص دمک اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ وہ نئی دلہن ہے۔ ''میں میڈم کے کمرے میں جا رہی ہوں۔'' سلیقے سے دوپٹا اوڑھتے ہوئے کنول نے معظم کو اطلاع دی اور کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' معظم بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ کمرے سے نکلتے ہی ان کا سامنا مومو سے ہوا۔ وہ سفید چہرے کے ساتھ اس کمرے کے دروازے پر جہاں ملازم کے مطابق حسینہ آرام کر رہی تھی، کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے موموِ؟'' معظم اس کی حالت دیکھ کر ٹھٹکا۔

''مما گھر پر نہیں ہیں پاپا۔'' موموِ، معظم کو سامنے پا کر بلکتی ہوئی اس سے آ چمٹی۔

''کیا مطلب؟ کہاں گئی وہ؟'' معظم بوکھلایا۔

''بیگم صاحبہ ہاسپٹل میں ہیں صاحب۔ ایک گھنٹے پہلے ان کی طبیعت کافی بگڑ گئی تھی۔ نرس ہاسپٹل سے ایمبولینس منگوا کر انہیں اپنے ساتھ ہاسپٹل لے گئی۔ جانے سے پہلے انہوں نے سختی سے ہمیں حکم دیا تھا کہ آپ کو ان کے ہاسپٹل جانے کے بارے میں نہ بتایا جائے۔'' موموِ کے بجائے جواب ایک ملازم نے دیا وہ پہلے بھی شاید یہیں کھڑا تھا لیکن معظم کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔

''ہم ہاسپٹل چلتے ہیں۔'' کنول نے معظم کے ملازم پر غصہ نکالنے سے قبل تیزی سے تجویز پیش کی اور خود موموِ کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر پیار سے تسلیاں دیتے ہوئے گھر کے بیرونی راستے کی طرف بڑھنے لگی۔ معظم نے بھی خود پر قابو پاتے ہوئے پیش قدمی کی۔ وہ بہت طوفانی رفتار سے گاڑی چلاتا ہوا ہاسپٹل پہنچا تھا۔

''اس وقت وہ بہتر ہیں لیکن ہم آپ کو بہت زیادہ امید نہیں دلا سکتے۔'' ہاسپٹل پہنچ کر ڈاکٹر سے استفسار کرنے پر معظم کو یہ جواب ملا تھا۔ معظم کی خواہش پر دو گھنٹے بعد ڈاکٹر نے اسے آئی سی یو میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ آئی سی یو میں حسینہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی دکھائی دی تھی۔ اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن تکلیف کی جو کیفیت اس کے چہرے پر ثبت ہو گئی تھی اس سے ظاہر تھا

کہ وہ موت وزیست کی شدید کشمکش سے گزر رہی ہے۔ مصنوعی تنفس کے ذریعے اس کی سانسیں بحال کرنے کی اطلاع تو خود ڈاکٹرز نے بھی اسے دی تھی۔ معظم دکھی دل کے ساتھ حسینہ کے بے رونق چہرے کو دیکھ کر آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اسے آئی سی یو میں بھی زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ملی۔ وہ ساری رات اس نے، کنول اور مومو نے آنکھوں میں کاٹی۔ بہت اصرار کے بعد ڈاکٹرز کی طرف سے کنول اور مومو کو بھی محض اتنی دیر کے لیے کہ وہ حسینہ پر ایک نظر ڈال سکیں، آئی سی یو میں جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس بلاخیز رات کی صبح اس انداز میں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر نے حسینہ کی خواہش پر ان تینوں کو اس سے ملنے کی اجازت عطا کر دی۔

''تم تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میرا دل کتنی خوشی اور اطمینان محسوس کر رہا ہے، یہ میں لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔'' حسینہ نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان تینوں کا استقبال کرتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا۔

''لیکن ہماری خوشی اس وقت مکمل ہوگی جب آپ اس بیڈ سے اٹھ کر ہمارے ساتھ گھر چلیں گی۔'' کنول نے حسینہ کا ہاتھ تھام کر محبت سے کہتے ہوئے سب کے جذبوں کی ترجمانی کی۔

''میرے پاس اب مہلت ہی کہاں رہی ہے؟ یوں بھی انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہو پاتی بہت کچھ پانے کے بعد بھی وہ تشنہ رہ جاتا ہے اور اس تشنگی کو قبول کر لینا ہی رب کی رضا میں راضی ہو جانا ہے۔ میں نے بہت دیر میں یہ بات سمجھی لیکن امید ہے کہ تم میں سے کوئی یہ غلطی نہیں کرے گا۔'' کنول کی بات کے جواب میں یہ بات کہتے ہوئے حسینہ کے ذہن میں اس کی پوری زندگی کا نقشہ تھا۔ اسے یاد تھا کہ کیسے بے سروسامانی میں معظم کا ساتھ مل جانے پر اس نے ناشکری کرتے ہوئے اولاد سے بچھڑنے کے غم کو اس بری طرح خود پر سوار کیا تھا کہ نہ کبھی خوش رہی تھی اور نہ ہی معظم کو خوش رکھ سکی تھی۔ حالانکہ اللہ نے تلافی کے طور پر اسے مومو سی پیاری بیٹی بھی عطا کر دی تھی۔ اس بات کو حسینہ نے اب جا کر سمجھا تھا اور یہ سمجھ مل جانے کے بعد اس میں صبر کی وہ صفت پیدا ہوئی تھی جس نے اسے دینے پر اکسایا تھا۔ وہ معظم کی زندگی میں خوشی کا دیپ جلانے کے بعد اتنی سیراب ہو گئی تھی کہ اپنے بیٹوں کا پتا ٹھکانا جان لینے کے باوجود ان سے وقتِ آخر نہ ملنے کی تشنگی قبول کر لی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ جن چیزوں پر اس نے اس دنیا میں صبر کر لیا ہے وہ اللہ آخرت میں اسے ضرور عطا کر دے گا۔

☆☆☆

''سر! ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کنول صاحبہ کی والدہ ہیں۔''

انٹرکام پر ملنے والی اس اطلاع نے معظم کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ آج حسینہ کی موت کے بعد چوتھا دن تھا اور وہ پہلی بار فیکٹری آیا تھا۔ حسینہ اس دن ہاسپٹل میں ان تینوں سے مشترکہ ملاقات کے دو گھنٹے بعد ہی مر گئی تھی۔ اسے علاج کے لیے لندن لے جانے کی نوبت ہی نہیں آ سکی تھی۔ غم کے ان لمحات میں کنول نے بھرپور ساتھ دیا تھا۔ خصوصاً مومو کو سنبھالنے اور حوصلہ دینے میں اس کا کلیدی کردار رہا تھا۔ کنول کی والدہ اور بہن بھائی بھی تین دن تک مسلسل معظم کے گھر آتے رہے تھے۔ ان تین دنوں میں معظم کا وقت زیادہ تر مردانے میں گزرا تھا اس لیے اس کا کنول کی والدہ سے سامنا نہ ہو سکا تھا کچھ وہ خود بھی گریزپا نظر آتی تھیں۔ ایسے میں ان کی یہاں فیکٹری میں معظم سے ملاقات کے لیے آمد معظم کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ حیران سا معظم ان کی آمد کے مقصد کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ ایک آدمی کی رہنمائی میں وہاں چلی آئیں۔

''السلام علیکم۔ آئیں تشریف رکھیں۔'' معظم نے اپنے رشتے کے اعتبار سے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ہوئے احترام سے کہا۔ وہ دھیمی آواز میں معظم کے سلام کا جواب دے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ آج بھی انہوں نے خود کو اسی طرح چادر میں چھپا رکھا تھا جیسے پہلی بار معظم نے اپنے اور کنول کے نکاح والے دن انہیں دیکھا تھا۔

''فرمائیے آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے کی؟ اگر کوئی مسئلہ تھا تو گھر پر بھی بات ہو سکتی تھی یا اگر آپ میرے گھر پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں تو مجھ سے کہتیں میں خود آپ کے گھر آ جاتا۔'' انٹرکام پر ڈسٹرب نہ کرنے کا آرڈر دینے کے بعد معظم ان سے مخاطب ہوا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ میرا یوں یہاں آنا آپ کے لیے حیرت کا باعث ہے لیکن معاملہ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے گفتگو کے لیے آپ کا اور اپنا، دونوں کا گھر نامناسب معلوم ہوا۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے اور آپ کے درمیان جو گفتگو ہو اس سے ہم دونوں کے سوا کوئی واقف نہ ہو سکے۔'' معظم کی بات کے جواب میں کنول کی والدہ نے بے حد رسان سے وضاحت کی۔

''آخر ایسی کیا بات ہے؟'' معظم ان کی بات سن کر

اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"بات بہت اہم ہے۔ حسینہ صاحبہ اپنے انتقال سے پہلے ایک ذمے داری مجھے سونپ کر گئی تھیں۔ ان کی وصیت پر عمل کرنے کے لیے ہی آج میں یہاں آئی ہوں۔" کنول کی والدہ کی بات سن کر معظم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اسے یاد آیا کہ کنول سے نکاح سے پہلے بھی اسے یہ خیال آیا تھا کہ حسینہ نے کنول کی والدہ کو اس نکاح پر راضی کرنے کے لیے کسی طرح کی مالی امداد کا وعدہ کیا ہوگا۔ آج شاید وہ اسی وعدے کی یاددہانی کے لیے یہاں آئی تھیں۔ اس خیال کے آتے ہی معظم اپنا گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔

"آپ کے اور حسینہ کے درمیان کس طرح معاملات طے پاتے تھے یہ تو میں نہیں جانتا لیکن حسینہ نے آپ سے جو بھی وعدہ کیا تھا میں اسے پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ نے شاید میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے آپ کی بیگم کے کسی وعدے کا نہیں بلکہ ان کی سونپی ہوئی ذمے داری کا ذکر کیا ہے۔" کنول کی والدہ نے معظم کو ٹوکا۔

"کیسی ذمے داری؟" معظم الجھا۔

"کچھ حقائق آپ کے سامنے لانے کی ذمے داری۔ کنول سے آپ کا نکاح کرتے وقت ہم لوگوں نے آپ سے چند حقائق چھپائے تھے کیونکہ ہمیں اندازہ تھا کہ اگر آپ کے علم میں کنول کی اصلیت آگئی تو آپ اس نکاح کے لیے راضی نہ ہوں گے۔" کنول کی والدہ کی بات نے معظم کو کچھ اور الجھن میں ڈال دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کنول کی اصلیت کیا ہے؟ اور کیا یہ اصلیت اتنی خطرناک ہے کہ واقعی معظم اس نکاح پر راضی نہ ہوتا؟ کیا کنول کا تعلق کسی ایسے ویسے گھرانے سے ہے؟ وہ کسی کے گناہ کی یادگار ہے یا پھر خود ہی بدکردار اور کرپٹ لڑکی ہے۔ آخری بات پر تو معظم خود بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔ باقی اگر کوئی مسئلہ تھا اسے جاننے میں اسے دلچسپی نہیں تھی اسے کنول سے محبت تھی اور اس محبت میں وہ اس کی ذات سے جڑے کسی کمزور پہلو کو بہ آسانی نظرانداز کر سکتا تھا۔ اپنی اسی سوچ کے ساتھ وہ کنول کی والدہ سے بولا "کنول کا ماضی کیا تھا مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے وہ جو ہے، جیسی ہے ہر حالت میں قبول ہے۔"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کنول سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اسے ہر عیب کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن میری بات کا یہ مقصد نہیں تھا کہ کنول میں خدانخواستہ کوئی عیب ہے۔ میری بچی الحمدللہ بے حد معصوم اور باکردار ہے۔ میں اس کی اصلیت کے حوالے سے آپ کو جو حقیقت بتانا چاہتی ہوں اس کا تعلق براہ راست کنول سے نہیں بلکہ میرے، آپ کے اور حسینہ صاحبہ کے ماضی سے ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو وقتی طور پر بے شک آپ سے چھپالی گئی لیکن ہمیشہ اس بات کا چھپا رہنا ممکن نہیں اسی لیے آج میں خود سے آپ کو سب کچھ بتانے یہاں آگئی ہوں۔" کنول کی والدہ نے معظم سے یہ بات کہتے ہوئے اچانک ہی اپنے چہرے سے چادر ہٹادی۔ چادر کے پیچھے سے ظاہر ہونے والے چہرے کو معظم پہلی نظر میں شناخت نہیں کر سکا۔ حالات کی سختیوں سے گہنا جانے والے اس چہرے پر بیس اکیس سال پہلے کی ناجیہ کا چہرہ کھوج لینا آسان نہیں تھا۔ معظم کو پہچان کے مراحل طے کرنے میں کچھ وقت لگا اور جب وہ یہ مرحلہ طے کر چکا تو بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کے ساتھ "ناجیہ" کا لفظ بھی ادا کیا۔

"بیٹھ جایئے معظم صاحب! میں جانتی ہوں کہ اس وقت آپ بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوئے ہیں لیکن زندگی ان تلخ حقائق کا ہی نام ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ یہ سب نہ ہونے دوں لیکن ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش اور اپنی بیٹی کی خوشیوں کی خاطر ہار مان لی۔ حسینہ صاحبہ جنہیں میں بھی ماں کہہ کر پکارتی تھی میری وہ محسنہ ہیں جو اگر مجھ سے میری جان بھی مانگتیں تو میرے لیے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں تو میری بچی کی خوشیوں کا بھی سوال تھا۔ کنول نے اپنی زبان سے کبھی مجھے آپ کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میں ماں ہو کر اس کے اندر آنے والی تبدیلیوں سے کیسے ناواقف رہتی؟ میں نے بہت پہلے جان لیا تھا کہ وہ آپ کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اپنی دو عزیز ہستیوں کی خاطر میں اس نکاح کے لیے تیار ہو گئی۔ اس کے لیے مجھے کتنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا یہ داستان الگ ہے لیکن بہرحال میں کسی نہ کسی طرح اظہر کو اس نکاح میں ولی کی حیثیت سے شامل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اظہر کی مخالفت کا سبب آپ کی اور کنول کی عمروں کے درمیان موجود فرق تھا باقی حقائق تو اسے بھی نہیں معلوم۔ بیچارا ساری زندگی آپ سے نفرت کرنے کے باوجود آپ کو پہچانتا تک نہیں ہے۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد ایک سات سالہ بچہ اس لائق نہیں ہوتا کہ بچپن میں دیکھی جانے والی شکل کو اتنے طویل عرصے بعد شناخت کر سکے۔ یہی معاملہ آپ کے ساتھ بھی ہوا۔ آپ بھی اظہر کو نہیں پہچان سکے۔ ہم لوگوں کو تو پہلے ہی اس بات کا یقین تھا یوں بنا کسی رکاوٹ کے آپ کا اور کنول کا نکاح خیر و خوبی

انجام پا گیا۔'' ناجیہ بہت سکون سے کوئی داستان سنانے کے انداز میں معظم کو حقائق سے آگاہ کر رہی تھی۔

''اتنا بڑا دھوکا۔ تم لوگوں نے مجھے کاٹھ کا پتلا سمجھا تھا جو میرے ساتھ یہ سب کر گزرے؟ اف خدا؟ میں کیسے ان تلخ حقائق کو قبول کروں؟ تم لوگوں کو ذرا خیال نہیں آیا کہ رشتوں کا یہ گورکھ دھندا کتنا نازک ہے؟ میں نے حسینہ کے ساتھ بیس سال ازدواجی زندگی گزاری ہے اور تم لوگوں نے کنول کو میری بیوی بنا دیا یہ سوچے بغیر کہ کنول اور حسینہ کا آپس میں کیا رشتہ بنتا ہے؟''

معظم چیخ پڑا تھا۔

''ان دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ حسینہ صاحبہ میری سوتیلی ماں تھیں اور یہ رشتہ ابا کے انہیں طلاق دینے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ شرعاً ان کا اور کنول کا ایسا کوئی تعلق نہیں بنتا کہ ان دونوں کے آپ کے نکاح میں آنے میں کوئی قباحت ہو۔ اخلاقی طور پر پابندی عائد ہو سکتی تھی لیکن اس صورت میں کہ اس کہانی کا ہر کردار ابتدا سے سب کچھ جانتا ہوتا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس حیثیت میں ایک دوسرے سے نہیں ملا کہ خود کو کسی رشتے سے بندھا محسوس کرتا۔ خود آپ جب کنول سے ملے اور اس کی محبت میں مبتلا ہوئے تو کیا آپ کو خبر تھی کہ وہ کون ہے؟ کنول تو اب بھی کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میں چاہتی ہوں کہ اسے معلوم ہو۔ زندگی میں ہر سچ بولنا ضروری نہیں ہوتا خصوصاً ایسا سچ جو زندگی کو آسان بنانے کے بجائے مشکل تر بنا دے۔''

ناجیہ، معظم کے ردعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی اس لیے بہت پُرسکون انداز میں اس سے گفتگو کر رہی تھی۔

''خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ اس وقت میں کچھ بھی سننے اور سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' معظم شاہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے چلایا۔

''ٹھیک ہے، میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ ویسے بھی اب مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ فیصلے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بس اتنی درخواست ضرور کروں گی کہ ماضی کے ہر حوالے کو بھول کر اپنے حال کی بہتری دیکھیں۔ آپ کو اس مشکل صورتحال سے دوچار کرتے ہوئے ہم دونوں خواتین نے بھی یہی کیا تھا۔ اگر آپ ماضی کو فراموش کر دیں تو آپ، کنول اور مومو بہت خوبصورت زندگی گزار سکتے ہیں۔ ویسی زندگی جو ایک مرتی ہوئی عورت نے آپ کو دینی چاہی تھی۔''

ناجیہ نے اپنے سابقہ پُرسکون انداز میں معظم سے یہ چند جملے کہے اور چادر کو پہلے ہی کی طرح اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتی ہوئی معظم کے آفس سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''آپ نے گھر واپس آنے میں بہت دیر کر دی۔ فون بھی نہیں کیا۔ میں نے فیکٹری سے معلوم کیا تو پتا چلا وہاں سے آپ دوپہر کو ہی نکل گئے تھے۔ میں سارا وقت پریشان ہوتی رہی۔ آپ کا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔ کہاں چلے گئے تھے آپ؟'' معظم کو ناجیہ کے کیے گئے انکشافات نے ذہنی طور پر بہت الجھا دیا تھا۔ اسی الجھن کے زیر اثر وہ سارا وقت ادھر اُدھر بھٹکتا رہا تھا۔ گھر واپس آنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر گہری ہوتی رات نے اسے احساس دلایا کہ کنول اور مومو اس کے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی ناچار وہ واپس گھر لوٹ آیا۔ گھر پہنچتے ہی اس کا کنول سے سامنا ہوا۔ وہ اس کی منتظر تھی اور حسب توقع پریشان ہو رہی تھی۔

''مومو کہاں ہے؟'' کنول کو دیکھ کر معظم کے احساسات عجیب سے ہو گئے تھے چنانچہ اس کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے خشک سے انداز میں مومو کے بارے میں پوچھا۔

''مومو اپنے کمرے میں ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میری آپ سے بات ہو گئی ہے اور آپ نے گھر دیر سے واپس آنے کو کہا ہے اس لیے وہ مطمئن ہے۔'' کنول نے بتایا تو معظم سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز میں موجود بے گانگی اور اضطراب کو محسوس کرتی ہوئی کنول بھی اس کے پیچھے تھی۔

''کھانا لگواؤں آپ کے لیے؟'' وارڈروب کھول کر کھڑے معظم سے اس نے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' یک لفظی جواب دے کر معظم نے ہینگر میں لٹکا اپنا ایک آرام دہ شلوار قمیص نکالا اور وارڈروب بند کر دیا۔

''اچھا آپ فریش ہو جائیں۔ میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔'' کنول نے اس کے اجنبی انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''تھینکس۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم بس مومو کا خیال رکھو ابھی وہ صدمے میں ہے اس لیے اسے زیادہ دیر تنہا چھوڑنا مناسب نہیں۔'' معظم کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ کنول کو زیادہ دیر اپنے بیڈ روم میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ کنول نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور ''جی اچھا'' کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد معظم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہینگر ایک طرف ڈالا اور خود سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ یہ لڑکی جس سے اس نے اس وقت اتنی بے رخی برتی تھی اسے کبھی

عزیز تھی یہ وہ خود بھی بہتر جانتا تھا۔ اسے دیکھ کر برسوں بعد اس نے اپنے اندر زندگی کی امنگ محسوس کی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اپنے لیے بھی کچھ خواب دیکھے لیکن اب جو تلخ حقیقت سامنے آئی تھی اس نے سارے خوابوں کو یکدم مسمار کر دیا تھا۔ کنول کا ناجیہ کی بیٹی ہونا اور ناجیہ کے حوالے سے حسینہ سے بننے والا رشتہ اسے بری طرح الجھا رہا تھا۔ اس لڑکی کو جس کی سگی ماں کو بھی وہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا رہا تھا اپنی شریکِ حیات کی حیثیت سے قبول کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ کنول اس کے نکاح میں آ چکی تھی اور شرعی و قانونی حیثیت سے اس کی بیوی تھی۔

''کیا مجھے کنول کو اس بندھن سے آزاد کر دینا چاہیے؟ یوں بھی ابھی یہ رشتہ صرف کاغذی حیثیت رکھتا ہے۔''

معظم کے ذہن میں یہ سوچ ابھری تو وہ مضطرب و پریشان ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس رشتے کو ختم کر دینا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اس رشتے کو ختم کر دینے کی صورت میں صرف وہی تکلیف نہ اٹھاتا، کنول بھی متاثر ہوتی۔ وہ جانتا تھا کہ کنول بھی اسے اتنی ہی شدت سے چاہتی ہے جتنا کہ وہ خود اسے چاہتا تھا۔ پھر وہ تو ایسی کسی حقیقت سے بھی واقف نہیں تھی جس نے معظم کا قرار چھین لیا تھا۔ ناجیہ نے بھی اسے یہی نصیحت کی تھی کہ کنول کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔

ناجیہ کا خیال آنے پر معظم نے اس کے اور اپنے درمیان ماضی میں پائی جانے والی جذباتی وابستگی کے بارے میں سوچا۔ آج دل میں اس وابستگی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس پر انکشاف ہوا کہ دراصل وہ جذباتی وابستگی محبت تھی ہی نہیں۔ وہ تو بس نوجوانی کے دنوں میں جذبات کے دریا میں ایک معمولی سے کنکر کے گرنے سے پیدا ہونے والا ارتعاش تھا جو بہت جلد ختم بھی ہو گیا۔ اگر ناجیہ کے لیے اس کے جذبات میں گہرائی ہوتی تو وہ اپنی تمام تر ہمدردی کے باوجود بھی حسینہ کو اپنی بیوی

کی حیثیت سے قبول نہ کر پاتا۔ ناجیہ اتنے برسوں میں اسے یاد رہی تو صرف حسینہ کی وجہ سے۔ اگر حسینہ کے بجائے اس کی شادی کسی اور عورت سے ہوتی تو وہ ناجیہ کو یکسر فراموش کر دیتا جیسا کہ کنول کے اس کی زندگی میں آنے کے بعد ہوا تھا۔ کنول کے لیے اس نے اپنے دل میں اتنی شدت محسوس کی تھی کہ اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ اس نے ناجیہ نامی کسی لڑکی کی کبھی تمنا بھی کی تھی۔ دراصل وہ جان گیا تھا کہ کسی لڑکی میں محسوس ہونے والی وقتی دلچسپی اور محبت میں کیا فرق تھا۔ کنول کی محبت اس کے روم روم میں بسی تھی لیکن اب یہ محبت بہت بڑے امتحان سے دوچار ہوگئی تھی۔ کنول سے دستبرداری ناممکن نظر آتی تھی تو اسے قبول کرنے کی راہ میں بھی حسینہ اور ناجیہ نامی عورتیں رکاوٹ بنی کھڑی تھیں لیکن کمال یہ تھا کہ رکاوٹ نظر آنے والی ان دو عورتوں نے ہی بھرپور کوشش کر کے کنول کو اس کی زندگی میں داخل کیا تھا اب اس کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کنول کو قبول کرے یا ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے بے دخل کر دے۔

☆☆☆

''پاپا آگئے؟'' کنول، مومو کے کمرے میں پہنچی تو اس نے مندی مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں آگئے ہیں۔ تمہارا پوچھ رہے تھے میں نے بتا دیا کہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔'' کنول نے تکیہ ٹھیک کر کے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''ٹھیک ہے میں صبح ان سے مل لوں گی ابھی تو وہ تھکے ہوئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کو بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا چاہیے۔'' مومو نے اسے مشورہ دیا۔

''میں یہاں ٹھیک ہوں۔ جب تک تم بورڈنگ نہیں چلی جاتیں میں تمہارے ساتھ تمہارے کمرے میں ہی رہوں گی۔'' کنول نے اسے جواب دیا۔

''یہ پاپا نے آپ سے کہا ہے؟'' مومو نے کنول کی بجھی ہوئی صورت دیکھ کر پوچھا، اب وہ مکمل طور پر نیند کے خمار سے باہر محسوس ہو رہی تھی۔

''وہ کیوں کہیں گے؟ میرا اپنا دل چاہ رہا ہے۔'' کنول نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ میری فکر مت کریں کنول باجی! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے مما کی ڈیتھ کو ایکسیپٹ کر لیا ہے۔ ویسے بھی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے بعد اداس نہ ہوں کیونکہ وہ آپ کو میری کیئر کرنے کے لیے میرے پاس چھوڑ کر جا رہی ہیں۔'' کنول کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے مومو نے اس سے کہا تو وہ مسکرا دی اور پھر بات بدلنے کے انداز میں بولی۔

''تو تم مجھے اپنی کیئر کرنے دو نا۔ خواہ مخواہ کیوں مجھے اپنے کمرے سے بھگانے پر تلی ہو؟''

''میں کیوں بھگاؤں گی؟ مجھے تو اتنا اچھا لگتا ہے آپ کا اپنے پاس رہنا۔ لگتا ہے میں ایک بار پھر چھوٹی سی بچی بن گئی ہوں اور میری مما میرے لاڈ اٹھانے کے لیے میرے پاس موجود ہیں۔ اب تو میں سوچ رہی ہوں کہ پاپا سے کہوں کہ مجھے واپس مری نہ بھجوائیں اور یہیں کسی اسکول میں داخل کروا دیں۔'' مومو نے بہت سادہ سے لہجے میں اپنی قلبی کیفیات کا اظہار کیا تو کنول نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی اور بے حد محبت سے بولی۔

''تم دوبارہ چھوٹی سی بچی بنی ہو یا نہیں، یا تمہیں اپنے اور میرے درمیان عمروں کا زیادہ فرق نظر آتا ہو یا نہیں سچ یہ ہے کہ ہمارے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ ہے اور اس رشتے کے حوالے سے تم مجھ سے جتنے چاہے لاڈ اٹھوا سکتی ہو۔''

''پھر وعدہ کہ آپ پاپا سے میرے یہاں ایڈمشن کے لیے بات کریں گی۔'' مومو نے کنول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''وعدہ۔'' کنول نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں باتیں کرتے کرتے مومو کب نیند کی وادی میں اتری اسے خبر نہ ہو سکی۔

اس کے سونے کے بعد کنول بہت دیر تک معظم کے رویے کے بارے میں سوچتی رہی۔ فیکٹری کے کسی مسئلے یا حسینہ کی موت کے باعث معظم کا یہ رویہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے انداز سے الجھا ہوا اور کنول سے گریزاں نظر آتا تھا۔ اس رویے کی کیا وجہ تھی کنول بہت غور کرنے کے باوجود سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بالآخر اس مسئلے کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ بھی مومو کی طرح نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

''آپ نے پاپا سے مجھے دوبارہ یہاں شفٹ کرانے کے سلسلے میں بات کیوں نہیں کی کنول باجی؟'' معظم ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا تب بہت دیر سے اشاروں کنایوں میں کنول کو بات کرنے پر اکساتی مومو نے کچھ روٹھے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

اقتباس: چند یادیں چند تاثرات از عاشق حسین بٹالوی
تعاون: محمد خان شنواری امیٹرو ول سائٹ کراچی

"تمہارے پاپا نے مجھے موقع ہی کہاں دیا؟ سارا وقت تو اخبار منہ کے سامنے کیے بیٹھے رہے۔" کنول نے لاچارے انداز میں مومو کے شکوے کا جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر میرے مسئلے کا کیا ہوگا؟ پاپا ابھی فیکٹری کے لیے نکل جائیں گے اور پھر رات گئے تک ان کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔" مومو کی پریشانی اپنی جگہ تھی۔

"اچھا تم پریشان مت ہو، میں ابھی کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ یوں بھی وہ تیار ہو کر ٹیبل پر نہیں آئے تھے اس کا مطلب ہے کہ انہیں فیکٹری جانے میں کچھ وقت لگے گا۔" مومو کو تسلی دے کر کنول اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ کمرے میں پہنچی تو معظم پینٹ شرٹ میں ملبوس آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھتا ہوا نظر آیا۔ کنول بیڈ کے کونے پر ٹک کر معظم کی اس مصروفیت کو دیکھتی رہی۔ ابھی تک اس کے اور معظم کے درمیان وہ بے تکلفی قائم نہیں ہوئی تھی کہ وہ بیویوں والا استحقاق استعمال کرتے ہوئے معظم کے ایسے کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتی۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" معظم ٹائی باندھ کر فارغ ہوا تو کنول نے ہمت کر کے اسے مخاطب کیا۔ معظم سے بات کرنے میں اتنی مشکل اسے تب بھی پیش نہیں آتی تھی جب وہ محض اس کی سیکریٹری تھی۔ مشکل کا سبب معظم کے انداز میں پایا جانے والا انجانا سا گریز تھا۔

"کہو، میں سن رہا ہوں۔" معظم نے اسے جواب دیا اور دراز کھول کر اس میں سے کاغذات نکالنے لگا۔

"میری اور مومو کی خواہش ہے کہ اس کا یہ سال مکمل ہو جانے کے بعد اسے واپس یہیں بلا لیا جائے۔ بورڈنگ کی نسبت مومو یہاں میرے ساتھ گھر میں رہ کر زیادہ بہتر طریقے سے اپنی پڑھائی کر سکے گی۔" کنول نے بنا کسی تمہید کے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ جواب میں معظم بنا کچھ کہے اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے دراز سے کاغذات نکالنے کے بعد اپنا بریف کیس بیڈ پر رکھا اور خود بھی وہیں بیٹھ کر کاغذات ترتیب سے بریف کیس میں رکھنے لگا کنول لب کاٹتے ہوئے اس کی یہ مصروفیت دیکھتی رہی۔ معظم کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے کنول کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"میرا پروگرام ذرا مختلف ہے اور اس پروگرام کے مطابق تم اور مومو اس گھر میں اکٹھی نہیں رہ سکتیں میں نے طے کیا ہے کہ فی الحال مومو بورڈنگ میں اور تم اپنی امی کے گھر میں رہو گی۔" اس وقت کنول معظم کی طرف سے جواب ملنے کی امید ختم کر بیٹھی تھی معظم نے کھٹ سے بریف کیس بند کرتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا جسے سن کر کنول بری طرح چونک گئی۔

"کیا مطلب؟" کنول کے لہجے میں واضح طور پر سراسیمگی تھی۔

"تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟ میں نے صرف ایک وقتی پروگرام کا ذکر کیا ہے۔" معظم نے کنول کے خوفزدہ ہونے کو محسوس کیا۔

"لیکن کیوں؟ وقتی طور پر بھی میں اس گھر کو چھوڑ کر اپنی امی کے گھر کیوں رہوں گی؟" کنول معظم کی بات سننے کے باوجود مطمئن نہیں ہوئی۔

"کبھی کبھی ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے وقتی دوری برداشت کرنی پڑتی ہے۔ حالات کچھ اس طرح کے ہیں کہ

مجھے پاکستان میں رہنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم کہیں بیرون ملک شفٹ ہو جائیں گے۔ اپنے وطن سے دوری بے شک مشکل ہے لیکن یہ دوری ہمیں دوسری بہت سی قباحتوں سے بچالے گی۔'' معظم کا جواب بہت واضح نہ ہونے کے باوجود کنول نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بولی۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ آپ کس قسم کی مشکلات سے دوچار ہوں گے۔ لوگ ہماری شادی کو موضوع بنا کر آپ کو ذہنی طور پر تنگ کر رہے ہوں گے اگر بیرون ملک شفٹ ہونے سے آپ کی یہ تکلیف دور ہوتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''تھینک یو کنول! مجھے تم سے یہی امید تھی لیکن دیکھو یہ سارا کام چند دنوں میں نہیں ہوگا مجھے جائزہ لینا پڑے گا کہ کہاں شفٹ ہونا بہتر ہے۔ ویسے میرا ارادہ ملائیشیا جانے کا ہے۔ وہاں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے، یہاں فیکٹری کو وائنڈ اپ کرنے اور پراپرٹی کو سیل کرنے کے لیے مجھے وقت درکار ہوگا۔ میں یہ کام پوری یکسوئی سے کرنا چاہتا ہوں اس لیے میری خواہش ہے کہ تم اس دوران اپنی امی کی طرف رہو۔ تمہاری اور موموئی طرف سے بے فکری ہوگی تو میں اپنا کام زیادہ تیزی اور آسانی سے کر سکوں گا۔'' معظم، کنول کو اس کی امی کے گھر بھیجے جانے کی وجہ بیان کرنے لگا۔

''اس سب کے لیے میرا امی کے گھر جانا ضروری تو نہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہ کر آپ کے کام میں مدد دے سکتی ہوں۔'' کنول نے خود کو میکے بھیجے جانے کے فیصلے پر اعتراض کیا۔

''جب میں ایسا کہہ رہا ہوں تو اس کا مطلب ہے یہ ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب ہم اپنی نئی زندگی کا باقاعدہ آغاز کریں تو میرے ذہن میں کوئی الجھن اور پریشانی نہ ہو۔ میں تمہیں اتنی ہی خوبصورتی کے ساتھ وہ سب دے سکوں جیسا کہ کبھی میں نے تمہارے لیے سوچا تھا۔'' معظم کی بات سن کر کنول کی دھڑکنیں مرتعش سی ہو گئیں۔ محبت جو گریزپا نظر آتی تھی درحقیقت اب بھی اس کے لیے قائم دائم تھی۔

''اس سارے سیٹ اپ کو بنانے میں جتنا بھی وقت لگے، میں تم سے رابطے میں رہوں یا نہ رہوں لیکن اس بات کا یقین رکھنا کہ میں جہاں بھی رہوں تمہارا ہوں اور ہمیں بالآخر ایک ساتھ رہنا ہے۔'' معظم نے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ایک اور جگنو کنول کے ہاتھ میں تھمایا۔

''مگر میں اس دوران کیا کروں گی؟ آپ سے رابطے میں رہے بغیر تو میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہو جائے گا۔'' کنول اب بھی گھبرا رہی تھی۔

''تم کہیں جاب کر لینا یا پھر کسی کورس وغیرہ میں ایڈمشن لے لینا۔ میں باقاعدگی سے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو خرچہ بھیجتا رہوں گا۔'' معظم نے اس کے مسئلے کا حل بتایا۔

''امی شاید آپ سے رقم لینے کو پسند نہ کریں۔'' کنول جو معظم سے شادی کے بعد مسلسل اپنے گھریلو حالات کے بارے میں فکرمند رہی تھی تشویش سے بولی۔ نکاح سے قبل اپنی امی کے سامنے بھی اس نے یہ مسئلہ رکھا تھا لیکن انہوں نے سختی سے ''یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔'' کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔ اب معظم نے پیش کش کی تو کنول کو خوشی تو ہوئی لیکن امی کی طرف سے وہ تذبذب کا شکار تھی کہ آیا وہ اس پیشکش کو قبول کریں گی بھی یا نہیں۔

''اگر تمہاری امی نے رقم لینے سے انکار کیا تو میں اس وقت تک تمہیں ان کے گھر چھوڑ دوں گا جب تک تمہارے چھوٹے بہن بھائی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔'' معظم نے ایک طرح سے کنول کی زبانی ناجیہ کو وہ پیغام پہنچانے کا بندوبست کیا جس کے بعد ناجیہ کے پاس انکار کی کوئی صورت باقی نہیں بچتی تھی۔ کنول بھی اس بات کو سمجھتی تھی اس لیے چپ ہو گئی۔

''اگر تمہارے سوالات ختم ہو گئے ہوں تو میں جاؤں؟'' پوری گفتگو کے دوران پہلی بار مسکراتے ہوئے معظم نے کچھ شوخ سے انداز میں کنول سے سوال کیا۔

''سوال تو اتنے ہیں کہ یہیں اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی زندگی گزر جائے۔'' جواباً کنول بھی شوخ ہوئی۔

''تو بس ابھی رہنے دو۔ باقی سوالات اس وقت کرنا جب ہم زندگی بھر ساتھ رہنے کے لیے دوبارہ اکٹھے ہوں۔'' معظم نے ہاتھ اٹھا کر کنول کو روکا اور بریف کیس لے کر کمرے سے نکل گیا۔ ساری زندگی کے حساب کتاب کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ کنول کو کھونے کا خسارہ برداشت نہیں کر سکے گا اور اس خسارے سے بچنے کے لیے اس نے اپنی دنیا سب سے الگ بہت دور بسانے کا سوچا تھا۔ بس اس دنیا کو بسانے کے لیے کچھ وقت درکار تھا مادی حوالوں سے بھی اور جذباتی اعتبار سے بھی۔ ذرا سے وقت اور دوری کے بدلے اگر زندگی بھر کی خوشیاں ملنے کا امکان تھا تو یہ سودا کچھ زیادہ مہنگا نہیں تھا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر مظہر! تھک گئے کیا؟" میرے ساتھی ڈاکٹر شہباز کی آواز نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔

"نہیں تھکنا کیا بس یونہی ریلیکس ہو رہا تھا۔ تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گئی؟" میں کرسی پر سیدھا ہو گیا تھا۔

"ہوں، بہت رش رہا آج۔ میرا تو حشر نشر ہو گیا۔" وہ بھی میری ساتھ والی کرسی پر گر گیا تھا۔

ناولٹ

"آج ہاسپٹل کے ایم ایس ڈیوٹی پر نہیں آئے؟" میں نے خان وجاہت ابراہیم کے متعلق استفسار کیا۔

"ملک ہیں بھئی۔ آئیں نہ آئیں۔ ان کی منگیتر صاحبہ جو راؤنڈ لینے آن پہنچی تھیں۔ ویسے غضب کی چیز ہے یہ خان زادی۔ صورت مثل حور ہے مگر انداز و ادا سے "جلاد" دکھائی دیتی ہے۔ مجال ہے جو کسی کو لفٹ کرائے۔"

شہباز نے منہ بنا کر کہا۔

"ہر وقت اپنے گھمنڈ میں رہتی ہے۔ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی۔ غنیمت ہے جو خان وجاہت ابراہیم سے سیدھے منہ بات کر لیتی ہے۔ بھئی کل کلاں کو ان کے پلے جو بندھنا ہے۔ ورنہ شاید انہیں بھی خاطر میں نہ لائی۔ ابھی صرف ایگزام دے کے آئی ہے ایم بی بی ایس کا مگر اکڑی یوں پھرتی ہے۔ جیسے ابھی سے ہسپتال کا چارج سنبھال لیا ہے۔"

ڈاکٹر شہباز بڑی تفصیل سے خان زادی شیمل ابراہیم کے متعلق جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

"ہمیں کیا لینا دینا خان زادی کے انداز و ادا سے۔ وہ جانیں یا ان کے منگیتر خان وجاہت صاحب۔ ہمیں تو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"

مجھے کسی عورت کے بارے میں کھوج رکھنے کی عادت نہیں، سو سادگی سے موضوع سمیٹنا چاہتا تھا۔ شہباز کا روز کا معمول تھا جب بھی خان زادی اپنے باپ خان حیات ابراہیم کے قائم کردہ اس پرائیویٹ ہسپتال کا چکر لگاتی تھی۔ شہباز اس کو دیکھ کر اسی طرح جلتا کڑھتا تھا۔

"تو تو ہے ہی پکا پینڈو۔ بندے کو اتنا سیدھا، بیبا اور

بھلا مانس نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ چالاکی پیدا کرو اپنے اندر، یہ کیا کہ اردگرد سے بے خبر بس حقوق و فرائض کے کھونٹے سے بندھے کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلتے رہتے ہو۔"

میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

"مجھے اپنی یہی عادت پسند ہے۔ میری بے بے جی نے یہی سکھایا تھا کہ اپنے کام سے مطلب رکھو۔ دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہو۔ جو دوسروں کے کرنے کے کام ہیں۔ وہ انہیں کرنے دو' خوامخواہ دخل اندازی نہ کرو۔ اس طرح اپنی منزل بھی کھوٹی ہو جاتی ہے۔"

مجھے "حیات ہاسپٹل" میں تعینات ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے اور اس دوران بارہا شہباز سمیت دیگر کولیگز سے اپنی سیدھی و شفاف فطرت اور سادہ لوحی کے متعلق تبصرے سن چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میں نہ بے وقوف ہوں اور نہ بزدل۔ بس اتنا ہے کہ شرارت اور بدلحاظی میری سرشت میں شامل نہیں ہے۔ میں ہر شخص سے حسب مراتب اور حسب روایت احترام روا رکھنے کا قائل ہوں۔ بے جا سرکشی' ضد اور بدتمیزی میری طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔

میرے ادب آداب کے یہ طور طریقے میرے ساتھی ڈاکٹرز کو ناپسند تھے۔ مگر میں اپنے حال میں مست و مگن تھا۔

"صاحب جی! آپ کا خط آیا ہے۔" ڈیوٹی کے بعد میں ہاسپٹل سے نکل کر اپنی رہائش گاہ پر آیا تو بے بے جی کا خط میرا منتظر تھا۔ میں بے تابی سے چوکیدار کے ہاتھ سے جھپٹ کر کھولنے لگا۔ خط میرے چھوٹے بھائی اظہر کے ہاتھ سے لکھوایا گیا تھا۔ اظہر اس سال ساتویں کلاس کا امتحان دے رہا تھا۔

"پتر مجو!"

تو تو دوسرے علاقے میں جا کے ماں کو بھول ہی بیٹھا۔ تین ہفتے گزر چلے ہیں مگر کوئی خط پتر نہیں ملا۔ خط خیال سے ہر ہفتے بھیج دیا کر میرے بچے کہ تیری ماں کی نظریں چوکھٹ پر ہی رہتی ہیں۔ یہ موئے پیٹ کی آگ بھی کتنی ڈھاڈی ہوتی ہے۔ میں دن رات دعائیں کرتی ہوں کہ کسی طرح پنجاب کے کسی ہسپتال میں تیری نوکری لگ جائے۔ طرح طرح کے دھڑکوں سے تو جان چھوٹے۔ اچھا سن پتر! تیری ماسی اختری مجھ سے دو تین بار پوچھ چکی ہے بہانے بہانے سے' وہ کہتی ہے شمیم کے لیے پیام آرہے ہیں اگر مرضی ہو تو بتا دیں پھر بعد میں گلہ نہ کرنا۔ شمیم آٹھ جماعتیں پاس کر چکی ہے اور اب پرائیویٹ میٹرک کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ ماشاء اللہ بڑی سلیقے طریقے والی سگھڑ اور سوہنی وی ہے۔ تو مجھے فٹافٹ اپنا ارادہ لکھ بھیج تاکہ میں اختری سے شمیم کے رشتے کے لیے بات شروع کر دوں۔ تیری چھوٹی بہن ننھی تجھے بہت یاد کرتی ہے۔ تیری آپا صغریٰ بھی پچھلے دنوں اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ اللہ رکھے اپنے گھر میں راضی خوشی ہے۔ اچھا پتر اب اجازت دے۔"

خط پڑھ کر بے اختیار میرے ہونٹوں پر ایک خوب صورت سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے چاہت سے خط مٹھی میں بھینچ کر آنکھوں سے لگایا جیسے بے بے جی کی خوشبو' ان کا لمس من میں اتارنا چاہتا ہوں۔

میرا تعلق صوبہ پنجاب کے ضلع وہاڑی کے ایک گاؤں کرم پور سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں سے حاصل کرنے کے بعد میں نے شہر سے ایف ایس سی کی اور پھر بہاولپور میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ہاؤس جاب کے لیے سال بھر خوار ہوتا رہا۔ ملتان کے ایک ہاسپٹل سے ہاؤس جاب مکمل کی تو نوکری ڈھونڈنے کے لیے آزمائش کا ایک دریا عبور کرنا پڑا۔ آج کل تو ڈاکٹرز کی بہتات کا یہ عالم ہے کہ ایک اینٹ اٹھاؤ تو دس ڈاکٹرز نکلتے ہیں۔ آسامیاں کم امیدوار زیادہ اور مقابلہ سخت۔ سو مجھ سمیت بہت سے ڈاکٹرز ہاتھوں میں ڈگریاں پکڑے جوتیاں چٹخا رہے تھے۔

میرا تعلق دوسرے درجے کے زمیندار گھرانے سے تھا۔ والد صاحب کی تھوڑی سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے سارا کنبہ پل رہا تھا۔ ماں باپ کی امیدوں کا مرکز میری تعلیم کے خاتمے پر ایک شاندار ملازمت کا حصول تھا۔ مگر پے در پے مقصد میں ناکامی نے مجھے کم اور انہیں زیادہ مایوس کیا تھا۔ پر گزشتہ سال

والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا تو ساری ذمہ داری مجھ پر آن پڑی تھی۔

اسی زمانے میں اخبار میں شمالی علاقہ جات میں قائم کیے جانے والے پرائیویٹ ہسپتال کے لیے دو خالی آسامیوں پر ڈاکٹرز کی ضرورت کا اشتہار شائع ہوا۔ رہائش اور کھانے پینے کی سہولیات مفت تھیں اور تنخواہ بھی پرکشش تھی۔ یہ ہاسپٹل وادیٔ سوات میں منگورہ شہر سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع دیہات اوڈیگرام میں خان حیات ابراہیم نے قائم کیا تھا۔

کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ میں نے اشتہار پڑھ کر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ کسی مشہور و معروف بڑے سرکاری ہسپتال میں جاب حاصل کرنے کی زبردست خواہش کو خواب سمجھ کر بھلا دیا اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود پشاور میں واقع خان حیات ابراہیم کی ذاتی کوٹھی پر انٹرویو کے لیے چلا آیا۔ خان صاحب کی فیملی شہر میں رہتی تھی۔ غالباً بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے خان حیات ابراہیم نے شہر میں رہائش رکھی تھی۔ مگر ان کی آبائی حویلی اوڈیگرام میں ہی تھی۔

ان کی اپنی ایک ہی بیٹی تھی البتہ بھائی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے وجاہت کو باپ بن کر پالا تھا۔ وجاہت ڈاکٹری پاس کر کے دو سال لندن میں اسپیشلائز کرنے کے بعد حیات ہاسپٹل کا انتظام سنبھال چکے تھے۔ البتہ بیٹی خیبر میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔

"اتنی دور نہ جاؤ ویر جی! ان پتھروں پہاڑوں میں تو خط پتر بھی نہیں پہنچتے ہوں گے۔ یہ نہ ہو تمہیں ہمارے جینے مرنے کی خبر بھی نہ ملے۔" بے بے جی کے ساتھ ساتھ صغریٰ آپا نے بھی مجھے روکنے کی بہتری کوشش کی تھی۔ مگر مجھے اپنے کندھوں پر پڑی ذمہ داری کا بخوبی احساس تھا۔ میں انھیں بہلا کر چلا آیا۔

خلافِ توقع میں بہت جلد اس پہاڑی ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔ جب میں نے اپنی پہلی تنخواہ پر آٹھ ہزار کا منی آرڈر بھجوایا تو بے بے جی خوشی سے رو پڑی تھیں۔ یکمشت اتنی بڑی رقم ہاتھ میں آنا خواب لگ رہا تھا۔ پھر یہ سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ میں چار ماہ بعد چھٹی پر گھر گیا تو اماں بچا گھر بسا کر جا چکی تھیں اور اب ننھی کے جہیز اور میری ہونے والی دلہن کے لیے بری کی چیزیں جمع کر رہی تھیں۔ میں ان کی دور اندیشی پر کتنی دیر تک ہنستا رہا تھا۔

ننھی ابھی بارہ برس کی کم سن لڑکی تھی۔

"لڑکیاں بڑی ہوتے کون سا دیر لگتی ہے۔" بے بے جی میری ہنسی کا برا مان گئی تھیں۔

"اوفوہ کن سوچوں میں کھو گیا۔ ابھی بے بے جی کے خط کا جواب لکھنا ہے۔" میں خود کو لتاڑ کر سیدھا ہوا اور قلم کاغذ ڈھونڈنے لگا۔

"بے بے جی! جیسے آپ کی مرضی۔ جو آپ کی پسند ہے وہی میری۔ آپ جانتی ہیں مجھے ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ آپ اپنے دل کی کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو پھر شمیم واقعی اچھی ہو گی۔"

میں نے پوری قلبی آمادگی کے ساتھ تحریر کر دیا اور حقیقتاً ایسا ہی تھا۔ مجھے عورتوں کے معاملات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اور سچی بات تو یہ ہے کہ اب تک ایسا مصروف رہا تھا کہ ان باتوں کی طرف دھیان بھی نہیں گیا تھا۔ اس میں سارا کمال بے بے جی کی تربیت کا تھا۔ اب انہوں نے احساس دلایا تو خیال آیا تھا کہ بندے کو زندگی میں شادی بھی کرنا ہوتی ہے۔

——*

صبح اٹھا تو کھڑکی سے باہر نظر پڑتے ہی برف کی سفید چادر سامنے آ گئی۔ رات برف باری ہوئی تھی۔ سارا علاقہ برف سے ڈھک گیا تھا۔

میں دونوں ہاتھ آپس میں مسلتا ہوا خود کو حرارت پہنچانے کی سبیل کر رہا تھا۔

آج میری صبح کی ڈیوٹی نہیں تھی، سو آرام و اطمینان سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے لباس تبدیل کیا۔ میرا ارادہ دریا پر جانے کا تھا۔ دریائے سوات اس گاؤں کے پاس سے گزرتا ہے۔ گاؤں کے اردگرد پھیلے پھلوں کے باغات اور کھیت سب برف پوش ہو چکے تھے۔ مقامی باشندوں سے پتا چلا تھا کہ اوڈیگرام کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ یہاں تقریباً ساڑھے نو سو

سال پہلے اوڈی نای بت پرست قوم آباد تھی۔ پھر محمود غزنوی کے حملے اور قبضے کے بعد اس گاؤں میں بھی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ کچھ عرصہ پہلے محکمہ آثار قدیمہ نے کھدائی کے بعد یہاں ایک پرانی مسجد دریافت کی تھی۔

میں دوپہر تک یہاں وہاں پھرتا رہا۔ یخ بستہ سرد ہوائیں جسم و جاں میں پھریری سی دوڑا دیتی تھیں۔ مگر اب میں یہاں کے رنگ بدلتے موسموں کا عادی ہو چکا تھا۔

تقریباً" دو بجے میں ہاسپٹل کے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ ارادہ تھا کہ ہاسپٹل کی کینٹین سے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد معمول کا کام شروع کروں گا۔

"بات سنیے گا ڈاکٹر صاحب۔" کینٹین کا راستہ ریسپشن سے گزر کر جاتا تھا جونہی ریسپشن پر پہنچا۔ اسٹاف میل نرس نے بہ عجلت پکار کر روکا تھا۔

میں مڑ گیا اور سوالیہ نظروں سے ایاز کو دیکھا۔

"وہ خان زادی صاحبہ سر وجاہت کے کمرے میں ہیں۔ کہہ رہی تھیں جو بھی ڈاکٹر ملے، اسے فوراً" میرے پاس بھیج دیں۔ کوئی ایمرجنسی آئی ہے۔"

خان زادی کی آمد کے سبب میل نرس کا لہجہ خود بخود مستعد اور مؤدب ہو گیا تھا کہ اس کی سخت گیر فطرت سے سب خوف کھاتے تھے۔ حالانکہ خان وجاہت ابراہیم ہاسپٹل کے ایم ایس تھے۔ نگران سے اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا خان زادی شیمل سے، خان وجاہت ہنسوڑ، بے فکری اور لاپرواسی طبیعت کے مالک تھے۔ خوش طبع، خوش باش اور خوش لباس شخص تھے۔ ان کے مقابلے میں خان زادی کی طبیعت میں پر اسرار اور مرعوب کر دینے والی خاموشی، سرد مہری اور انانیت پسندی نمایاں تھی۔ نیک شگون یہ تھا کہ کم از کم وہ خان وجاہت کے ساتھ نرمی اور صلح جوئی سے پیش آتی تھی۔ ورنہ یہ رشتہ کبھی نہ نبھ سکتا۔

یہ ساری باتیں شہباز ہی گاہے بگاہے میرے کانوں میں انڈیلتا رہتا تھا۔ بذات خود میں نے خان فیملی کے معاملات کھوجنے میں کبھی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔

میں نے لنچ پر فاتحہ پڑھ کر خان وجاہت کے کمرے کا رخ کیا۔ دستک کا جواب پا کر اندر داخل ہوا تو سیاہ سمور کے لمبے کوٹ اور سیاہ ہی بڑے سے مفلر میں سا چہرہ لپیٹے خان زادی کو کمرے میں تنہا پا کر جھجک سا گیا۔

"السلام علیکم۔ آپ نے بلایا تھا؟"

پہلی بار اسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آیا کہ کس لقب سے مخاطب کروں۔ میڈم، بی بی، خان زادی یا مس؟ بس یونہی سلام جھاڑ کر ہچکچاتے ہوئے پوچھ ڈالا۔

"آپ یہاں ڈاکٹر ہیں؟"

وہ پلٹ کر میرا جائزہ لے رہی تھی۔

"جی ہاں۔" نظریں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"مظفر حسین۔" میں اپنے جوتوں کی نوک پر نگاہ جما کر آہستگی سے بولا۔

"او کے مسٹر مظفر۔ آپ فوری طور پر میڈیکل باکس، دو میل نرس اور چیک اپ کا سامان لے کر ساتھ کے گاؤں روانہ ہو جائیں۔ سرجن جمیل بھی ابھی ابھی روانہ ہوئے ہیں۔ ادھر کچھ لوگ زخمی ہو گئے۔ تین مرد ہیں اور ایک عورت، عورت کو فرسٹ ایڈ دینے کے بعد ہاسپٹل لے آئیں۔ میں دیکھ لوں گی۔"

وہ تحکمانہ انداز میں بات مکمل کرنے کے بعد ٹیلی فون پر کوئی نمبر ملانے لگی۔ غالباً" اپنی حویلی بات کر رہی تھی۔

"نواز خیل، گل محمد سے کہو، بابا کی جیپ ہاسپٹل لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈراپ کرنا ہے۔ وجاہت صاحب کی جیپ کھڈے میں گر کر تباہ ہو گئی ہے اور ہاسپٹل کی گاڑی میں ایک ڈاکٹر پہلے سے روانہ ہو چکے ہیں۔"

اس نے فون رکھ دیا۔

مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ خان وجاہت کی جیپ کیسے تباہ ہوئی! اور وہ اس وقت کہاں ہیں؟

"جیپ آتے ہی آپ روانہ ہو جائیے گا۔ بابا جان بھی ادھر ہی ہوں گے۔" میں سر ہلا کر باہر نکلا مگر ذہن

میں ہلچل مچ گئی تھی۔ خان زادی کے لب و لہجے سے تشویش اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔

--*

یہ عقدہ دو تین روز بعد خود بخود حل ہو گیا۔

ساتھ کے گاؤں میں خان حیات ابراہیم کے مخالف قبیلے سردار دونوں قبیلے پشتوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے چلے آ رہے تھے۔ تین روز قبل خان وجاہت جیپ پر اپنے آدمیوں کے ساتھ ہنگورہ شہر سے واپس گاؤں کی طرف آ رہے تھے کہ راستے میں شمشیر خنک کے قبیلے کی ایک الھڑ نار پر نگاہ پڑی۔ وہ جیپ روک کر لڑکی کے پاس آ گئے اور یونہی چھیڑ خانی شروع کر دی، وہ لڑکی کو جیپ میں ڈال کر اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے تھے مگر لڑکی نے واویلا مچا دیا جس پر اس کے قبیلے کے تین چار بندے جمع ہو گئے۔ صورت حال دیکھ کر وہ بھڑ گئے اور خان وجاہت کے بندوں پر گولیاں چلا دیں۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں خان وجاہت کا ایک بندہ اور مخالفین کے دو بندے شدید زخمی ہوئے۔ حملے کے دوران ایک گولی لڑکی کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔

زخمیوں کو فوری امداد کے بعد ہاسپٹل میں لایا گیا۔ تینوں مرد تو کسی طرح بچ گئے۔ مگر لڑکی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوسرے دن چل بسی۔ وہ سردار شمشیر خنک کی سگی بھانجی تھی۔ یہ قتل کوئی معمولی قتل نہیں تھا۔ اگر جرگے والے بیچ بچاؤ نہ کرتے تو دونوں قبیلوں میں ہولناک جنگ چھڑنے کا امکان تھا۔

خان زادوں اور سردار زادوں کی رنگین مزاجی کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لیکن یہاں معاملہ مخالف قبیلے کا تھا اور وہ بھی سردار کی بھانجی کا۔

--*

"کیا ہو رہا ہے جناب۔" شہباز کامن روم میں داخل ہوتے ہوئے حسب معمول چہکا۔ میں مڑ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"ادھر خان کی حویلی میں تو طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔"

"کیوں خیریت۔"

میں فائل بند کر کے کرسی پر آ بیٹھا۔

"جرگے نے فیصلہ سنا دیا ہے۔ جس پر پندرہ روز کے اندر اندر عمل در آمد ہونا لازم ہے۔"

"کیسا فیصلہ۔" میں خان وجاہت والے کیس کو بھول بھال چکا تھا۔

"جان کے بدلے جان کے اصول کے تحت انہوں نے خان زادی شمیل کو سردار شمشیر خنک کے حوالے کرنے کا حکم صادر کیا ہے۔"

میرے سر پر جیسے چھت آن رہی۔

"کیا۔"

"ہم نہیں خان کی حویلی سے عورت چاہیے۔ چاہے وہ خان ابراہیم کی بیٹی ہو، بہن ہو یا خان وجاہت کی بیوی۔"

"اوہ۔" میں اس اچانک جھٹکے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کہاں وہ پچاس سالہ بڈھا سردار شمشیر خنک اور کہاں خان زادی شمیل جیسی گلبدن۔ بیچ بیچ خدا بھی کیسے کیسے لوگوں کو نوازتا ہے حسن کا انمول خزانہ۔"

شہباز اپنے مخصوص انداز میں ہانک رہا تھا مگر میرا ذہن کسی اور ہی خیال کے تانے بانے بن رہا تھا۔ موجودہ صورت حال میں اگر خان زادی کا نکاح خان وجاہت سے پڑھا دیا جائے تب بھی وہ جرگے کے قانون کے مطابق سردار شمشیر خنک کی تحویل میں جانے سے نہیں بچ سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرح وہ خان وجاہت کی بیوی ہونے کے ناتے فیصلے کی رو سے مخالف قبیلے کے سپرد کر دی جاتی۔

"کیا کوئی اور راستہ نہیں نکلتا ان کے قوانین میں۔" میں یونہی اپنی معلومات کی غرض سے شہباز سے پوچھنے لگا۔

"ہوتا ہے۔ اگر مخالف قبیلہ راضی ہو جائے یا "بازو" میں دینے کے لیے لڑکی نہ ہو تو قصوروار قبیلے سے ایک خطیر رقم کے بدلے سمجھوتا طے پا جاتا ہے۔ رقم دے کر حساب بے باق کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں اس صورت حال سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لڑکی موجود ہے۔"

----*

اس فیصلے کے تقریباً بارہ دن بعد اچانک ہی مجھے خان کی حویلی میں طلب کر لیا گیا ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ میری دوڑ بس ہسپتال سے رہائشی مکان اور وہاں سے دریا کے کنارے تک تھی۔

ملازم مجھے براہ راست خان حیات کے پرشکوہ بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ خان وجاہت بھی وہیں موجود تھے۔

"السلام علیکم خان جی۔" بڑے خان کو دیکھ کر میرا دل خود بخود مؤدب و مرعوب ہو کر تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ میں اونچے شملے والی پرشکوہ پگڑی باندھے سر جھکائے شکستہ خوردہ سے ساگوان کے پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

میں جانتا تھا وہ اپنی اکلوتی اولاد خان زادی شمیل سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ اسی لیے قبیلے کی روایات کے برعکس بیٹی ہونے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور ڈاکٹری مکمل ہونے تک اپنے آبائی گاؤں سے میلوں دور شہر میں رہائش کا انتظام کیا تھا۔

"ادھر آ کر بیٹھو مظہر! ہمیں تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔" خان حیات نے بیڈ کے سرہانے بہت قریب رکھی کرسی کی سمت اشارہ کیا تو میں جھجک سا گیا۔

"ہم ابھی آتے ہیں خان بابا۔" نجانے خان وجاہت کو کیا سوجھی کہ ایک دم اٹھ کر باہر چلے گئے۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔" میں کچھ جھجک کر کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"نہیں خان جی۔" میں چپ چاپ اگلی بات کا منتظر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"وجاہت دیکھنے میں لاپروا ہے مگر کام کا دھنی ہے۔ ہسپتال کے ایک ایک بندے پر نظر رکھتا ہے اور ہمیں باقاعدگی سے رپورٹ دیتا ہے تمہاری ایمانداری، سادگی، شرافت اور فرض شناسی کی اکثر ہی تعریف کرتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا انتخاب غلط ثابت نہیں ہوا۔ تم نے عملاً بتا دیا ہے کہ تم اس جاب کے سب سے زیادہ اہل تھے۔"

میں ورطۂ حیرت میں گم ان کے منہ سے نکلنے والے توصیفی کلمات سن رہا تھا۔

"اگر ہم اپنا ذاتی کام تمہارے سپرد کریں تو کیا تم اسی ایمانداری فرض شناسی اور شرافت سے پورا کرنے کی ضمانت دے سکتے ہو؟"

"آپ حکم کیجئے خان جی۔" ان کے پراسرار انداز میرے لیے الجھن پیدا کر رہے تھے۔

"اگر ہم کچھ عرصے کے لیے اپنی بیٹی شمیل تمہارے سپرد کر دیں شرعی نکاح کے کاغذات کے ہمراہ تو کیا تم اسی ایمانداری اور شرافت سے کچھ عرصے بعد دوبارہ ہمیں واپس کر سکتے ہو؟" وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

جیسے کہیں سات سمندر بپھرے ہوئے طوفان بن کر آپس میں ٹکرائے تھے۔

"جی۔" میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو یوں ہونق بن کر انہیں دیکھا جیسے وہ مذاق کر رہے ہوں۔

خان حیات کا چہرہ صدیوں کا ضعیف اور نقاہت زدہ لگ رہا تھا۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور رنگت تانبے کی طرح تمتما اٹھی تھی۔ یقیناً غیرت و حمیت کا کڑا امتحان پاس کر کے یہ تجویز نوک زبان پر لائے تھے۔

"ہمیں اپنے دونوں بچوں کی خوشی عزیز ہے۔ ہم بچپن کے اس بندھن کو ختم کر کے اپنی بچی کو درندوں کے حوالے نہیں کر سکتے۔ آج بارہ دن گزر چکے ہیں۔ صرف تین دن باقی ہیں اس کے بعد کوئی پتا ہمارے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ ہم نے خان وجاہت کے ساتھ سر جوڑ کر مغز ماری کے بعد یہ ترکیب نکالی ہے کہ کسی طرح عارضی مدت کے لیے شمیل کو اس علاقے سے غائب کر دیا جائے اور گاؤں میں یہی مشہور کرایا جائے کہ وہ کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ اس طرح مخالفین دو تین ہفتے ادھر ادھر جھک مارنے کے بعد مقدمہ نپٹانے کے لیے رقم کی ادائیگی پر راضی ہو جائیں گے اور جب یہ معاملہ حل ہو جائے تو اس کے بعد طلاق دلوا کر اسے خان وجاہت سے بیاہ دیا جائے۔"

[illegible] میں موجود [illegible] ہوئے بھی خود کو حاضر محسوس کر رہا تھا۔ میرا وجود کسی خلا میں تیرتے سیارے کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔

"اس مقصد کے لیے ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تم بھروسے کے آدمی ہو۔ شریف اور بہادر ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ تم خان زادی کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرو گے۔ میں چاہتا ہوں۔ تم لوگ اس علاقے سے نکل کر مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے دوسرے صوبے میں داخل ہو جاؤ۔ صوبہ پنجاب کا کوئی پسماندہ سا گاؤں زیادہ مناسب رہے گا۔ پنجاب جیسے گنجان آباد اور زرعی و صنعتی صوبے میں کسی بندے کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ سیدھے سفر مت کرنا۔ اِدھر اُدھر کبھی کسی قصبے، کسی شہر یا دیہات میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنا تاکہ تعاقب کرنے والے دھوکے میں آ کر تم لوگوں کا سراغ کھو بیٹھیں۔ آخری منزل تمہارا اپنا گاؤں ہو گی۔ مگر خبردار سیدھے اُدھر مت جانا کیونکہ سردار شمشیر خٹک تمہارے ہمراہ فرار کی خبر سن کر سب سے پہلے تمہارے آبائی گاؤں کی طرف بندے دوڑائے گا۔"

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں، خان حیات ابراہیم اور ان کے الفاظ کسی طویل خواب کا حصہ ہیں۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ کس سے کہہ رہے تھے اور کیوں کہہ رہے تھے۔ میں سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر میری سماعتیں سن ہو رہی تھیں۔

"خان جی! آپ میرے محسن ہیں۔ اگر آپ کے خاندان پر کوئی برا وقت آیا ہے تو میں مقدور بھر خدمات پیش کرنے کے لیے سر کے بل تیار ہوں۔ مقصد خان زادی کو رازداری و ذمہ داری سے کسی محفوظ مقام پر پہنچانا ہے تو میں ان کی حفاظت کا بیڑا اٹھاتا ہوں لیکن ان سے نکاح کی گستاخی مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔"

بڑی تگ و دو کے بعد اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے میں نے گھٹے گھٹے لہجے میں سر جھکا کر آہستگی سے کہا تھا۔

"خود خان زادی اور خان وجاہت بھی اس حق میں نہیں ہیں مگر نکاح کرنا مجبوری ہے۔ اس کی دو اہم وجوہات ہیں۔ [illegible] لے گیا ہو۔

میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں اور ہماری روایت ہے کہ جو لڑکی گھر سے بھاگ جائے، اس کی بازیافت ہونے یا لوٹ آنے پر اس کی سزا موت ہوتی ہے لیکن اگر وہ جس کے ساتھ فرار ہوئی ہے اس سے نکاح کر چکی ہو تو اس صورت میں اسے زندہ رکھا جاتا ہے اور اس کا معاملہ قبیلے کے سردار کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اگر سردار چاہے تو دونوں کا نکاح فسخ کروا کے لڑکی کو اپنے قبیلے کے کسی بندے سے بیاہ سکتا ہے اور اگر لڑکا لڑکی طلاق پر راضی نہ ہوں تو لڑکی کو قبیلے سے خارج کر دیا جاتا ہے اور دونوں میاں بیوی کو ہمیشہ کے لیے اس علاقے سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ انھیں تاعمر یہ اجازت نہیں ہوتی کہ دوبارہ اس جگہ قدم رکھ سکیں۔"

"اوہ۔" میں نے اضطراری انداز میں مٹھیاں بھینچ لیں۔

"اس لیے جب تک نکاح نامے کی کاپی ہمارے پاس نہیں ہو گی، قبیلے والے خان زادی کی واپسی کو قبول نہیں کریں گے۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ تم لوگ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرو گے۔ کسی ہوٹل یا سڑک پر چیکنگ کے دوران مشکوک جوڑا سمجھ کر پولیس تمہیں دھر لے گی، اِدھر میدانی علاقوں میں بڑے سخت قانون ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی تم لوگوں کو کسی کے ہاں پناہ لینی پڑے۔ اس صورت میں شرعی رشتے کا ثبوت لازم ٹھہرے گا۔"

خان حیات ابراہیم بلا کے دور اندیش تھے۔ مجھے افسوس ہوا بھلا اتنے فہم و فراست والے متحمل مزاج شخص کا بھتیجا اتنا ناعاقبت اندیش کیسے بن گیا کہ بے سوچے سمجھے مخالف قبیلے کی لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"میں تمہیں آج رات کی مہلت دیتا ہوں۔ کل صبح مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔" ان کی تیز نظریں میرے چہرے پر پھیلی کشمکش کی لکیریں بھانپ چکی تھیں۔

"لیکن خیال رہے۔ اس کمرے کی کوئی بات دوسرے کان تک نہیں پہنچنی چاہیے۔" کل شام

نکاح کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد جیب میں کچھ ضروری سامان کے ہمراہ تم خان زادی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ گے۔ نکاح نامے کی ایک کاپی ہمارے پاس رہے گی۔ ہم اگلے دن اس فرار کی خبر عام کر دیں گے اور شمشیر خٹک سے ہم لاعلمی اور غم و غصے کا اظہار کریں گے۔ اسے یہ بھنک نہیں پڑنے دیں گے کہ اس فرار کے پیچھے ہمارا ہاتھ ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح تم لوگوں کو ڈھونڈے گا۔ بالآخر پندرہ بیس دن بعد ناکام ہو کر ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم سے خطیر رقم کے عوض معاملہ نپٹانے کا مطالبہ کرے گا۔ اس کے دو ہفتوں بعد ہمارا بندہ تمہارے آبائی گاؤں آ کر تمہیں مطلع کرے گا اور یوں تم خان زادی کو لے کر "ڈیگرام" آ جاؤ گے چونکہ سردار شمشیر خٹک رقم لے کر معاملہ طے کر چکا ہوگا۔ اس لیے خان زادی کی بازیافت پر اس کا حقدار نہیں بن سکے گا۔"

یا اللہ کیسے گورکھ دھندے ہوتے ہیں یہ قبائلی قوانین و ضوابط۔ صد شکر کہ میرے جیسا سیدھا سادا بندہ یہاں کی پیداوار نہیں تھا۔ ورنہ میں تو اب تک کسی گولی کا نشانہ بن کر اس دنیا کو داغ مفارقت دے چکا ہوتا۔

میں حویلی سے باہر آ گیا تھا۔

وہ رات میرے لیے کانٹوں کا بستر بن گئی۔

دماغ چک پھیریاں کھا رہا تھا۔ اعصاب سنسنی خیز ہیجانی کیفیت سے دوچار تھے۔ بدن جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔

کہاں خان زادی شیحل جیسی دلکشی و تمکنت سے بھرپور ساحرہ اور کہاں مجھ جیسا عام سا سانولا سلونا سیدھا سادا دیہاتی بندہ وہ مالک تھی اور میں کمتر سا ملازم۔ کوئی میل ہی نہیں بنتا تھا۔ پھر خان وجاہت جیسے حسین و جمیل خوبرو شہزادے جیسی آن بان رکھنے والے منگیتر کی حسن آفتاب روشن و دلآویز شخصیت کے سامنے تو میری شخصیت بری طرح دب کے رہ جاتی تھی۔

خان زادی اور خان وجاہت ابراہیم ایک دوسرے کو دل سے پسند کرتے تھے۔ ان میں محبت اور یگانگت کا رشتہ تھا۔

میری تو "کاغذی" گنجائش بھی نہیں نکلتی تھی۔ چہ جائیکہ ایک ڈیڑھ ماہ کی مستقل رفاقت۔

کاش خان جی نے رازداری کی مہر نہ لگائی ہوتی تو میں "فوراً" سے پیشتر شہباز کو ساری صورت حال واضح کر کے مشورہ طلب کر لیتا۔

میں پیشانی مسلتا ہوا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

خان حیات ابراہیم نے جس تحکم اور تاکید سے گفتگو کی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر مجھے مکمل طور پر اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے منتخب کر چکے ہیں اور مجھ سے انکار کی ہرگز بھی توقع نہیں رکھتے۔

"کیا میں ہامی بھر لوں۔ مگر ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو میں نے بے جی کو شمیم کے لیے ہاں کی ہے۔" میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔

"ہوئے بے وقوفا! یہ کون سا مستقل رشتہ ہوگا۔ خان زادی اس کاغذ کے ٹکڑے سے تیری بیوی نہیں بن جائے گی۔ جو فاصلے ہیں وہ جوں کے توں برقرار رہیں گے۔"

مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بے جوڑ اور انمل سا عارضی تعلق مجھے بہت چبھ رہا تھا اگر خان حیات ابراہیم نے نکاح نامے کی اہمیت پر روشنی نہ ڈالی ہوتی تو میں بخوشی خان زادی کی ذمہ داری قبول کر لیتا۔

*_*_*

اگلی صبح بڑی عجیب اور سنسنی خیز تھی۔ میں خان حیات ابراہیم کی حویلی پہنچ کر اپنی فرمانبرداری کا ثبوت "ہاں" کی صورت پیش کر چکا تھا۔

نکاح کی کارروائی بڑی رازداری سے بند کمرے میں مکمل کی گئی۔

"خان جی! فقط ایک تشویش ہے۔ میرے جانے کے بعد گاؤں سے بے بے جی کے خط آئیں گے۔ ان کا جواب کون دے گا اور اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی اور مجھے گھر جانا پڑا تو اس کی مجھے کیسے اطلاع ہوگی۔"

"بے فکر رہو۔ تمہارے خط ہم سنبھال کر رکھیں

گے۔ تم اپنے گھر والوں کی تسلی کے لیے ابھی روانہ ہونے سے پہلے ایک خط لکھ دو کہ میں ہسپتال کے کام سے عملے کے ساتھ ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے مختلف علاقوں کے دورے پر جا رہا ہوں' واپسی پر خود خط لکھ کر رابطہ کروں گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

خان حیات ابراہیم کا آئیڈیا نہایت مناسب تھا۔ میں نے جلدی جلدی خط لکھ کر ان کے ایک ملازم سے لفافہ منگوا کر اس سے پوسٹ کروا دیا۔

"جیپ کے پٹرول اور خرچے پانی کے لیے یہ رقم رکھ لو۔" خان جی نے چمڑے کے ایک چھوٹے سے تھیلے نما بیگ میں تقریباً "ساٹھ ہزار روپے ٹھونسنے کے بعد اسے بند کر دیا۔

"میرا خیال ہے کافی رہے گی۔ اگر ناگہاں مزید کی ضرورت ہوئی تو کہیں سے فون کر دینا۔ میں بندہ بھیج کر رقم پہنچا دوں گا۔ اس بیگ کی باہر والی جیب کے اندر اعشاریہ بتیس بور کا ایک ریوالور اور گولیوں کے دو میگزین موجود ہیں۔ جان و مال کی حفاظت کے لیے ہتھیار کا ہونا لازمی ہے۔ ایک جیپ تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ جیپ کی بدولت ناہموار اور پتھریلے پہاڑی راستوں پر ڈرائیونگ کے لیے آسانی رہے گی۔"

وہ اپنے طور پر تمام انتظامات مکمل کر چکے تھے۔

اسی دوران خان وجاہت کمرے میں آ گئے۔

"شیمل کو جیپ میں بٹھا دیا گیا ہے بابا جان۔" میں نے مڑ کر چوری سے ان کی صورت دیکھی۔ چہرے پر مضطربانہ سرخ رنگوں کی شدت ظاہر کر رہی تھی کہ یہ گھڑیاں ان کے لیے حد درجہ کٹھن اور ناقابل برداشت ہیں۔ اپنی منگیتر کو اپنی چاہت کو اپنے ہاتھوں سے پرائے شخص کو سونپ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں وحشت کی لالی تیر رہی تھی۔

"ایک بات یاد رکھنا ڈاکٹر مظہر۔ ہم لوگ امانت میں خیانت کرنے والے شخص کو بڑی بھیانک سزا دیتے ہیں۔" خان حیات کمرے سے نکل گئے تھے اور اب میں اور خان وجاہت تنہا تھے۔ خان وجاہت کا سرد اور بھنچا ہوا لہجہ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

"آپ خواہ مخواہ کے واہموں اور اندیشوں کو دل میں جگہ نہ دیں سر۔" میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مضبوطی سے کہا۔

"میرے لیے خان زادی اتنی ہی غیر اور محترم ہیں جتنا اس کاغذی تعلق سے پہلے تھیں۔ رشتے کی نوعیت قلبی احساسات کے بدلنے پر منحصر ہوتی ہے۔ اس نام نہاد بندھن کا میرے ایمان پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ یوں بھی میری بے بے جی میری بات کہیں اور طے کر چکی ہیں۔"

"مجھے تم پر اعتماد ہے مگر بہرحال تم بندہ بشر ہو۔ اس لیے احتیاطاً باور کرایا ہے۔" وہ قدرے مطمئن ہو کر بولے۔

"میرے ایمان کی جڑیں اتنی کمزور نہیں ہیں سر۔" میرا لہجہ بے اختیار استہزائیہ ہو گیا۔ "عورت کبھی بھی میرا مسئلہ نہیں رہی۔ میں ان چیزوں سے دور بھاگتا ہوں۔"

خان زادی شیمل جیپ کی پچھلی سیٹ پر سیاہ گرم چادر میں لپٹی باپ سے الوداعی ملاقات کر رہی تھی۔ خان حیات ابراہیم کافی دیر تک مجھے راستوں کے متعلق گائیڈ کرتے رہے۔ پھر اللہ کا نام لے کر میں جیپ میں سوار ہو گیا۔ بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیشانی چومتے ہوئے ان کی آنکھیں بے ساختہ چھلک پڑی تھیں۔

"تمہاری امانت کا خیال رکھنا مظہر۔" ذمہ داری کا کڑا امتحان میرے کندھوں پر آ چکا تھا۔

*_*_*

ہم عصر کی اذانوں کے ساتھ حویلی سے چل پڑے تھے اور اب مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے ہو چکا تھا اور ابھی نہ جانے کتنا مزید باقی تھا۔ میں خاموشی اور توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پیچھے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

سڑک کے دونوں اطراف سفیدے کے سیدھے اور بلند و بالا درخت میلوں تک ساتھ ساتھ رہے پھر جیپ اس سڑک سے علیحدہ ہو کر مڑ گئی۔

اب دائیں جانب پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے نظر آ

رہے تھے۔ بائیں ہاتھ' باغات' کھیت اور چراگاہیں
تھیں۔ مخملیں گھاس کی چادر اوڑھے سرسبز میدان
آنکھوں کو تراوٹ بخش رہے تھے۔ دریائے سوات
اژدھے کی طرح بل کھاتا دور نشیب میں بہہ رہا تھا
سورج غروب ہونے کے بعد اطراف کے مناظر دھند
اور تاریکی کے غلاف میں ڈوبنے لگے تھے۔ سڑک
تنگ' پیچ دار اور ڈھلوانی تھی۔ یہ پہاڑی گزرگاہ تھی
اور سطح زمین سے سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں فٹ کی
اونچائی پر واقع تھی۔ ایسی خطرناک سڑکوں پر تو لوگ
تجربہ کار ڈرائیور کو ہمراہ لے کر آتے ہیں۔

گو کہ میں ڈرائیونگ میں ماہر تھا۔ لیکن رات کے
وقت انجان پہاڑی راستوں پر جیپ دوڑانا سراسر خود
کشی کے برابر تھا۔ یہاں اسٹریٹ لائٹس کی سہولت کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سرد ہوائیں ونڈ اسکرین پر
جم کر سفید باریک سی برفیلی تہہ کی شکل میں اپنے
نشانات ثبت کر رہی تھیں۔

"کیا کیا جائے؟" سڑک مسلسل چڑھائی کی طرف
جا رہی تھی۔ میں نے اسپیڈ بہت ہی کم رکھی تھی یوں
لگتا تھا جیسے کسی پہاڑ پر چڑھ رہے ہوں۔

ہمیں رات تک وادی عبور کر کے مالاکنڈ پہنچنا تھا
مگر اب ناممکن لگ رہا تھا۔ میں تاریکی میں اتنے پرپیچ
راستوں پر ڈرائیونگ نہیں کر سکتا تھا۔

سڑک کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر چھوٹے
چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ جگہ جگہ گوبر کے ڈھیر لگے تھے۔
جن پر مرغیاں ٹھونگ رہی تھیں گھروں کے ساتھ
ساتھ چھوٹی چھوٹی نالیوں میں دریائے سوات سے کٹی
ہوئی لہر کا میٹھا پانی سانسیں لے رہا تھا۔ نالیوں کے
دائیں بائیں مختلف پودوں کی جھالریں پھیل گئی تھیں
اور ان میں چھوٹے چھوٹے بنفشی پھول کھلے ہوئے
تھے۔

جب راستہ مکمل اندھیرے میں چھپ گیا تو میں
نے جیپ کچے پر اتار کر ایک گاؤں کی طرف موڑ دی۔
پھر کچھ فاصلے پر لے جا کر روکی اور اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ
کر کچھ سوچنے لگا۔

"کیا وادی کے لوگ اتنے مہمان نواز ہیں کہ وہ
اجنبی لوگوں کو رات بھر ٹھہرانے پر تیار ہو جائیں
گے۔"

میری سوچ کا محور یہی نکتہ تھا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟" جب جیپ بند کرنے کے
بعد دس منٹ تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا تو
پیچھے بیٹھی خان زادی شیمل بادل نخواستہ مخاطب
ہوئی۔ اس کے لہجے میں مخصوص جلال اور دھمک کے
بجائے خلاف توقع خوف' جھجک اور پریشانی تھی۔

"اندھیرے میں سفر جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اس
لیے گاؤں کے کسی مہربان شخص کا دروازہ کھٹکھٹانے کا
ارادہ باندھ رہا ہوں۔ آپ مشورہ دیجیے۔ کیا یہاں کے
مقامی لوگ اجنبیوں کی مہمان داری کے لیے آمادہ ہو
جاتے ہیں؟"

میں بغیر پیچھے مڑے آہستگی سے گویا ہوا۔

"جی ہاں' وہ اسے اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔"
اس نے مختصراً جواب دیا۔

میں جیپ سے نیچے اتر آیا۔ ایک کسان اپنی بھیڑ
بکریوں کو ہانکتا ہوا کندھے پر سبز چارے کی گانٹھ رکھے
جیپ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے روک
لیا۔ وہ درمیانی عمر کا جفاکش آدمی تھا۔

"بھائی صاحب! ہم لوگ سیاح ہیں۔ آپ کے
علاقے میں سیر و تفریح کے لیے کراچی سے آئے ہیں۔
راستے میں رات ہو گئی۔ ان خطرناک راستوں پر سفر
کرتے ہوئے شہر کے ہوٹل تک پہنچنا مشکل ہے۔
رات بسر کرنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش ہے کیا
آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟"

میں نے مصلحتاً "سیاحت اور کراچی کا حوالہ دیا تھا۔
تاکہ اگر خبر ہو جانے کے بعد شمشیر خٹک کے آدمی پوچھ
گچھ کرتے ہوئے کل اس گاؤں سے گزریں تو ہمارا
کھوج پا کر تعاقب میں نہ آ سکیں۔

"صاب! ہمارا غریب خانہ حاضر ہے۔ آپ کے
ساتھ کتنے بندے ہیں۔"

"میرے ساتھ میری بیوی ہے۔ بس۔" یہ کہتے
ہوئے غیر شعوری طور پر میری رنگت تمتما گئی تھی۔

"میں گلباز ہوں۔ جی یہ سامنے ہی میرا گھر ہے۔ آپ

اندر آئیں۔" میں جیپ کی طرف چلا۔ اس نے شیشہ نیچے کر کے سر قدرے کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ وہ سیاہ اونی شال پیشانی تک اوڑھے ہوئے تھی۔ سرد برفیلی ہواؤں کے تھپیڑے نے اس کے سفید و گلابی مخملیں گالوں کو سرخ قندھاری انار بنا دیا تھا۔ اس کی بلکی بھوری بڑی بڑی آنکھوں میں بے چینی اور اضطراب تھا۔

میں نے غالباً" پہلی مرتبہ براہ راست اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"آیئے بی بی۔ رات ٹھہرنے کا بندوبست ہو گیا ہے۔"میں نے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

میں نے مختصرا" اسے بتا دیا کہ کیا جھوٹ بولنا ہے۔ اس کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں تاہم وہ خاموش رہی۔

جیپ لاک کر کے پانی کی نالیاں عبور کرتے ہوئے ہم گلباز کے مٹی سے لپے چھوٹے سے گھر میں داخل ہو گئے۔ یہ دو کمروں ایک صحن اور چھوٹے سے باورچی خانے پر مشتمل سادا سا گھر تھا۔ خان زادی شیمل کو گلباز کی بیوی اور ماں دوسرے کمرے میں لے گئی تھیں۔

"ارے گلباز! تم نے اتنا تکلف کیوں کیا۔ بھائی ہم مسافر لوگ ہیں۔ بس ایک رات کی پناہ چاہیے تھی۔" بھنی ہوئی مرغی کے ساتھ تنوری روٹیاں دیکھ کر میں نے کہا۔

"جو تم لوگ کھاتے ہو وہی دے دینا تھا۔"

"صاب! ہم تو روٹی پر پیاز یا چٹنی لگا کر کھانے والے لوگ ہیں۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"تو کیا ہوا۔ ہم بھی وہی کھا لیتے۔"

"نہیں صاب۔ مہمان کے ساتھ ہم ایسا سلوک نہیں کر سکتے یہ ہماری غیرت کا مسئلہ ہے۔"

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ کمرے میں انگیٹھی پر کوئلے دہک رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ہم سرد شوریدہ ہواؤں کی یخ بستگی سے محفوظ تھے۔

کھانا کھانے کے بعد میں گلباز کے بچھائے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ میرے ساتھ والی چارپائی پر گلباز سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ خان زادی شیمل ساتھ والے کمرے میں عورتوں کے ساتھ سوئی تھی۔

صبح ناشتے کے بعد ہم نے رخت سفر باندھ لیا۔

جاتے ہوئے میں نے زبردستی پانچ سو کا نوٹ گلباز کے چھوٹے بچے کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ گلباز منع ہی کرتا رہ گیا۔ اس گھر کے مکینوں کے بے لوث خلوص اور خدمت نے میرا دل موہ لیا تھا۔

سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم مالاکنڈ پہنچ گئے۔ یہاں مالاکنڈ ایجنسی کے دفاتر کے علاوہ کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں اور ریسٹورنٹ وغیرہ تھے۔ یہ خوبصورت، پرسکون اور پرفضا جگہ تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے جیپ روک دی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

"آپ کھانا گاڑی میں کھائیں گی یا ہوٹل تک چلیں گی؟۔"میں نے ہلکا سا سر خم کر کے پیچھے دیکھا۔

وہ سیٹ سے ٹیک لگائے تھکے تھکے انداز میں کھڑکی سے اطراف کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ میرے سوال پر چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں اجنبیت اور خشکی تھی۔ میں ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا۔

"خدا جانے آگے کھانے پینے کی چیزیں ملیں یا نہ ملیں۔ میں پیک کروا لاتا ہوں۔ جب بھوک محسوس ہو لے لیجیے گا۔"

میں نیچے اتر آیا۔ ایک اوپن ایئر چھوٹے سے ہوٹل سے نان کباب لیے۔ خود وہیں بیٹھ کر کھایا۔ اس کے لیے پیک کروا لیا۔

چائے پی کر میں نے جیپ کا انجن چیک کیا۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ مالاکنڈ کے اطراف کے پہاڑ بے آب و گیاہ، خشک اور سنگلاخ تھے۔ ان کا رنگ گہرا بھورا تھا۔ ان چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

اب اگلی منزل تخت بھائی اور سنی کوٹ سے گزر کر مردان تھی جس کے بعد نوشہرہ اور اٹک تک کا سفر ہموار کھلی ہائی وے کے ذریعے طے کیا جاتا تھا۔ اصل

معرکہ ان پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی خوفناک سڑک پر ڈرائیونگ کا تھا۔ اس کے بعد میں ریلیکس ہو کر سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ شام تک ہم مردان پہنچ گئے۔

"دی لینڈ آف شوگر اینڈ تمباکو۔" مردان میونسپلٹی کا ایک بورڈ اس کی تصدیق کر رہا تھا۔

مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ مگر آرام کا سوچنا بھی اس وقت ناممکن تھا۔ ہمارے فرار کی سردار شمشیر خٹک کو اطلاع مل چکی ہوگی اور اس کے بندے کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ اسی خدشے کے پیش نظر میں جیپ چلاتے ہوئے بار باریک مرر سے پیچھے آنے والی گاڑیوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ جوں ہی کوئی مشکوک جیپ نظر آتی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔

نوشہرہ تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا گیا۔

اٹک کا پل پار کرنے کے بعد جی ٹی روڈ کے ذریعے راولپنڈی تک پہنچنا میرا ہدف تھا۔ اور مجھے ڈر تھا کہیں بھٹک کر دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ اب میں ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اٹک کے گرد و نواح میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

"اوہ گیارہ بج گئے۔" میں آستین ہٹا کر گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے چونکا۔ اس وقت ہم اٹک کے ایک قصبے کے بازار سے گزر رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ اس لیے بازار میں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

اردگرد کی عمارتوں کے سائن بورڈ دور کہیں جھلملاتے دکھائی دینے لگے تھے۔ میں ڈرائیونگ کرتا ہوا بغور انہیں پڑھ رہا تھا۔ مجھے رات ٹھہرنے کے لیے کسی ہوٹل یا سرائے کی تلاش تھی۔ ایک جگہ میں نے گاڑی روک دی اور باہر نکل کر بازار میں کھلی اکا دکا دکانوں کے مالکان سے معلومات لینے لگا۔

"ادھر کوئی بڑا ہوٹل تو نہیں ہے جی۔ البتہ کاکاجی کی ایک سرائے ہے جہاں مسافر لوگوں کے رات ٹھہرانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ وہ ادھر دائیں ہاتھ کو ڈسپنسری کے ساتھ والی عمارت ہے۔" ایک الیکٹریشن نے جامع تفصیلات فراہم کیں۔ میں نے خان زادی شمیل کو بتا کر اس کی سمت کا دروازہ کھولنا چاہا مگر اس نے اترنے سے انکار کر دیا۔

"پتا نہیں سرائے کا مالک کیسا آدمی ہو؟ مجھے یہ جگہ بہت عجیب اور پراسرار سی لگ رہی ہے۔ رات قیام کے بجائے سفر جاری بھی تو رکھا جا سکتا ہے۔"

اس کے لہجے میں جھلاہٹ، اندیشے اور بے اعتباری تھی۔

"بالفرض ہم پل کراس کر کے نکل بھی گئے تو بھی جی ٹی روڈ سے راولپنڈی تک کا سفر خاصا لمبا اور تھکا دینے والا ہوگا۔ رات آرام ضروری ہے۔ ورنہ اگلے دن فریش نہیں رہ سکیں گے۔ یہ کون سا ایک یا دو دن کا سفر ہے جو آج کل میں ختم ہو جائے گا۔" میں نے رسانیت سے سمجھایا۔

"ہم کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں بھی کمرے لے سکتے ہیں۔" اس کی نازک مزاجی پر بے ساختہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی تھی۔

"یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے بی بی۔ یہاں ہوٹل کی عیاشی ممکن ہی نہیں ہے۔ قیام کرنے کے لیے سرائے مل گئی مجھے غنیمت ٹھہری۔"

کچھ پس و پیش کے بعد وہ میرے ہمراہ نیچے اتر آئی۔ سرائے میں کھانے پینے کا انتظام ہوٹل کی طرح تھا۔ یعنی باقاعدہ لکڑی کی میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور ایک "چھوٹا" میزوں پر سرو کرنے پر مامور تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو اک ایسی عجیب سی مہک نے استقبال کیا جو بوسیدہ اور خستہ حال عمارتوں کا شناختی سمبل ہوتی ہے۔

اس وقت تقریباً" ساری ہی میزیں خالی تھیں۔ بس ایک میز پر دو مسافر بیٹھے چنے کی دال اور تنوری روٹی کا ڈنر کر رہے تھے۔

ہمیں بھی یہی لوازمات پیش کیے گئے۔

کھانے کے بعد میں نے کاؤنٹر پر موٹی توند اور گنجے سر والے کاکاجی سے دو کمروں کی بکنگ کے لیے بات شروع کی۔

"بابو جی۔ اتفاق سے اس وقت صرف ایک ہی کمرہ

خالی ہے۔"

"اوہ۔" اس اطلاع نے میرے طوطے اڑا دیئے۔ وہ میرا شناختی کارڈ، وزیٹنگ کارڈ چیک کر رہا تھا۔ ساتھ ہی شاید میں نے غلطی سے نکاح نامے والا پرچہ بھی اسے تھما دیا تھا۔

"کیا یہ بی بی آپ کی بیگم ہیں؟۔"

"ہ۔ہاں۔" میں نے گڑبڑاتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"بس تو پھر جی دوسرے کمرے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ پہلے حیران ہوا پھر دانت نکالنے لگا۔ "کہیں آپس میں کھٹ پٹ تو نہیں ہو گئی۔ جو الگ الگ کمرے میں سونا چاہتے ہیں۔"

"ن۔ نہیں۔ بھئی۔ وہ۔" میں نے کبھی زندگی میں خود کو اتنا ہونق محسوس نہیں کیا ہو گا جتنا اس وقت لگ رہا تھا۔ کوئی بات نہیں بن پڑی۔

"کیا یہاں قریب میں کوئی اور ہوٹل یا سرائے نہیں ہے؟۔" میں پریشانی سے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نہیں جی۔ میلوں تک کوئی اور سرائے نہیں ملے گی۔ مگر بابو جی! یہاں آپ کو کیا مسئلہ ہے۔ میرے پاس کمرہ تو ہے۔"

"اچھا۔ اچھا پھر ٹھیک ہے۔" دستور کے مطابق نصف ادائیگی کرنے کے بعد چھوٹے کی معیت میں سیڑھیاں طے کرنے کے بعد میں خان زادی کو لے کر اوپر کمرے میں آ گیا۔

"یہاں بہت گھٹن ہے۔" کمرے میں بان کی دو چارپائیاں، لکڑی کی میز، دو کرسیاں اور درمیان میں چھوٹی سی بوسیدہ دری بچھی تھی۔ کوئی آرائشی سامان نہیں تھا۔ مجھے تو بہرحال غنیمت لگا مگر خان زادی کی نفیس طبیعت پر یہ بند بند سا ملگجا ماحول بہت گراں گزر رہا تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں بی بی! مگر یہ مجبوری ہے۔" میں پشت پر ہاتھ باندھ کر کھڑا کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ کس چارپائی پر سونا پسند کریں گی؟"

"کیا؟۔" اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر خوف و ہراس نے جگہ لے لی۔ "کیا آپ بھی ادھر ہی اس کمرے میں سوئیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

اس کے لہجے کی لرزش میں میرے لیے شک اور بد اعتمادی کا تاثر جھلک رہا تھا۔ میں نے مختصراً کاکا جی سے حاصل کردہ معلومات اس کے گوش گزار کر دیں۔

"مگر۔ اس طرح۔" وہ جھجک گئی۔

"آپ تسلی رکھیں بی بی۔ آپ ایک مصیبت زدہ خاتون ہیں۔ میری سرداری میں دی گئی ہیں۔ اگر آپ کے دل میں میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہے تو براہ کرم اسے دور کریں اور بے فکری و سکون سے رات بسر کریں۔"

وہ کچھ جھجکتے ہوئے تکلف سے ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ساتھ رکھی دوسری چارپائی اٹھائی اور عین دروازے کے قریب جا کر بچھا دی۔ اب درمیانی فاصلہ خاصا زیادہ ہو گیا تھا۔

خان زادی یقیناً میری موجودگی کی وجہ سے بستر پر دراز ہونے سے ہچکچا رہی تھی۔ میں نے اس کا حجاب بھانپ لیا۔

لیمپ یونہی روشن چھوڑ کر میں نے اپنی چارپائی پر لیٹتے ہوئے چادر سر تک تان لی اور کچھ دیر بعد میں بے خبر سو رہا تھا۔

❤ ❤ ❤

صبح چھ بجے میری آنکھ کھلی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ باہر ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے مڑ کر میز پر رکھا لیمپ بجھاتے ہوئے سرسری سی نظر محو خواب خان زادی پر ڈالی۔

غالباً تھکاوٹ کے باعث اسے گہری نیند آئی تھی۔ اس نے سیاہ اونی شال تہہ کر کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ کمبل بے ترتیب سا ہو کر آدھے سے زیادہ فرش پر جھول رہا تھا۔ اس کی سیاہ ریشم سی گھنی زلفیں چہرے اور شانوں پر پریشان تھیں، ایک ہاتھ گال کے نیچے تھا اور دوسرا چارپائی کی پٹی پر جما ہوا تھا۔

میں نے بے اختیار نظر موڑ لی تھی۔ بہرحال انسان

تھا۔ فرشتہ نہیں تھا کہ ایسے دلکش اور ہوش اڑا دینے والے حسن کو دیکھ کر ایمان متزلزل نہ ہوتا۔
میں آواز پیدا کیے بغیر چارپائی اٹھا کر پہلے والی جگہ پر بچھانے کے بعد نیچے آگیا۔
"چھوٹے! ناشتہ مل جائے گا؟۔" وہ میزوں پر کپڑا پھیر رہا تھا۔
"صاب جی! سات بجے تک بنے گا۔ روٹی، مکھن، کباب اور دودھ چائے۔ اتنی جلدی تو بس چائے ہی تیار ہو سکتی ہے۔ ابھی تو ٹھیک طرح صبح بھی نہیں ہوئی۔"
"سات بجے تک ہم نہیں رکیں گے۔ تم ایسا کرو، کسی دکان سے بسکٹ کا ایک ڈبہ لے آؤ اور ساتھ چائے تیار کرو۔ بلکہ اوپر کمرے میں پہنچا دینا۔"
میں آرڈر دے کر اوپر آیا۔ تو وہ اٹھ کر شال اوڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بے اختیار میری طرف پشت کرلی تھی۔ رخ پھیرنے سے اس کی کمر پر پھیلے گھٹنوں کو چھوتے بے پناہ لمبے اور گھنے بال پشت پر چھا گئے تھے۔
"وہ۔ آپ تیار ہو جائیں۔ ہمیں چائے پی کر یہاں سے نکلنا ہے۔" میں خفیف سا ہو کر سر کھجانے لگا۔
کچھ دیر بعد ہم اٹک پہنچ گئے۔ یہاں مغلوں کا بنایا ہوا وہ قلعہ جس کا ایک سرا پہاڑ پر اور دوسرا دریائے سندھ کی لہروں کو چوم رہا تھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ جی تو چاہتا تھا۔ یہیں رک کر ان تاریخی مقامات کا جائزہ لوں مگر ٹائم بہت کم تھا۔
اٹک کے تاریخی پل سے کچھ فاصلے پر میں نے اچانک بریک لگا دیے۔
"ہمارے پاس ایک ریوالور اور نقدی کی صورت میں ایک خطیر رقم بیگ میں موجود ہے۔ اسے کسی جگہ چھپانا ہوگا۔ میرا خیال ہے پچھلی سیٹ کے نیچے رکھ دیتے ہیں۔"
"مگر کیوں؟۔" وہ اپنے پاس رکھے اس بیگ کو اٹھا کر تجسس سے الٹ پلٹ کرنے لگی۔
"وہ سامنے دیکھیے۔" میں نے پل پر کھڑے کچھ باوردی اشخاص کی طرف اشارہ کیا جو گاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔
"یہ کسٹم کی چیکنگ پوسٹ ہے۔ لنڈی کوتل اور باڑہ میں غیر ملکی مال کی منڈیوں سے اشیاء خرید کر سرحد اور پنجاب کے اندرونی اضلاع میں منتقل کی جاتی ہیں۔ اس اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے یہ چیک پوسٹ قائم کی گئی ہے۔ پل سے گزرنے والی ہر گاڑی کی تلاشی لی جاتی ہے۔" میرا مسئلہ اس بیگ کو چھپانا تھا۔
"کیا جامہ تلاشی بھی لی جاتی ہے۔" وہ کچھ سوچ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔
"ٹھیک ہے۔ پھر فکر کی کوئی بات نہیں۔" اس نے چھوٹے سے اس بیگ کو اپنی گود میں رکھ کر اوپر سے اچھی طرح سیاہ اونی شال پھیلا کر اوڑھ لی۔
جونہی گاڑی بیریئر پر رکی کسٹم کے دو مستعد جوان ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گئے۔
"اپنے کاغذات دکھائیے پلیز۔" میں نے خاموشی سے پکڑا دیے۔
"آپ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں؟۔"
"ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور سوات کی وادی سے ہنی مون ٹرپ سے واپس آ رہے ہیں۔" میں نے اعتماد سے کہا۔
کسٹم کے جوانوں نے سرسری سے انداز میں جیپ کا جائزہ لینے کے بعد اوکے کر دیا۔
میں نے کلمۂ شکر پڑھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔
"آپ کو برا تو لگا ہوگا۔ مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔" کچھ دور جا کر مطمئن ہونے کے بعد میں نے ایک لمحے کو آئینے میں پیچھے دیکھتے ہوئے خجالت سے اسے مخاطب کیا تھا۔ اس کے گورے دودھیا چہرے پر تمتماہٹ سی پھیل گئی تھی۔ ان دو دنوں کی رفاقت میں میں نے جانچا تھا کہ بظاہر وہ کتنی ہی سرد مہر اور مغرور سہی مگر طبعاً" شرمیلی اور باحیا لڑکی تھی۔ اس میں وہ مخصوص بےباکی مفقود تھی۔ جو شہر کی پڑھی لکھی امیر کبیر چنچل سی لڑکیوں کا خاصا ہوا کرتی ہے۔ اس کے انداز میں ایک وقار، اور سنجیدگی تھی جو اس کی پر

تمکنت و حسین شخصیت پر بہت بھلی محسوس ہوتی تھی۔

حسن ابدال سے گزرتے ہوئے دوپہر تک ہم راولپنڈی پہنچ گئے۔ میں نے "فلیش مین" ہوٹل کے سامنے گاڑی پارک کردی۔

دو کمرے بک کروانے کے بعد ہم نے لنچ کیا اور پھر اپنے اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے پہنچ گئے۔

+_+_+

مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا کر چور کردیا تھا' سو دوپہر کے کھانے کے بعد جانے کتنی دیر تک اپنے کمرے میں سویا رہا۔

ایک تیز' مسلسل اور خبردار کرتی ہوئی دستک نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں بنا جوتے پہنے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

"کیا ہوا؟۔" خان زادی شمیں کا گھبرایا ہوا سراسیمہ چہرہ' پھولی سانسیں اور آنکھوں سے ٹپکتی وحشت نے ایک ثانیے میں میرے خوابیدہ حواسوں کو جھنجھوڑ کر چاق و چوبند کردیا تھا۔

وہ تیزی سے اندر آئی اور دروازہ بند کرکے اس سے پشت ٹکادی۔

"میں نے ابھی ابھی کھڑکی سے سردار کے بندوں کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا ہے۔ گاڑی مخالف رخ جارہی تھی۔" وہ سرگوشیانہ بولی۔

"کیا؟۔" مجھ پر بجلی سی گری تھی۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ سردار شمشیر خٹک کے بندے ہی تھے؟۔"

"میں اپنے علاقے کے لوگوں کو آنکھیں بند کرکے پہچان سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں تیقن تھا۔

"وہ کسی بھی لمحے ہوٹل کا رخ کرسکتے ہیں اور پارکنگ میں کھڑی جیپ پہچان کر ہم تک پہنچنا بے حد آسان ہوجائے گا۔" وہ بدحواسی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میرا ذہن تیزی سے اگلے اقدام کے تانے بانے بن رہا تھا۔

میں نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔

شام کے پانچ بجنے کو تھے۔

"راولپنڈی میں ریلوے اسٹیشن ہے۔ وہیں چلتے ہیں اور جو بھی ٹرین مل جائے ٹکٹ لے کر روانہ ہوجائیں گے۔ موجودہ صورت حال میں بائی روڈ سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ میری تجویز سنتے ہی الرٹ ہوگئی اور اپنے کمرے سے بیگ لینے گئی میں نیچے استقبالیہ کلرک کے پاس آگیا۔ کمرے ایک رات کے لیے بک کروائے گئے تھے۔ میں نے فل پے منٹ کرنے کے بعد چابیاں جمع کرائیں اور شمیں کو ہمراہ لے کر پارکنگ لاٹ میں آگیا۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد پہلے میں نے پچھلے دروازے کا لاک کھولا پھر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تاکہ باہر کھڑی خان زادی شمیں سے بیگ لے کر اگلی سیٹ پر رکھ سکوں۔

مگر دوسرے ہی لمحے میں حیرت زدہ رہ گیا جب خان زادی اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں سر جھٹک کر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ جیپ کا رخ ریلوے اسٹیشن کی جانب تھا۔

"وہ۔ وہ۔" جونہی میں موڑ مڑنے لگا' میرے ساتھ بیٹھی خان زادی شمیں نے اچانک دونوں ہاتھوں سے میرا بایاں بازو پکڑلیا۔ اس کی گرفت میں ہیجانی کیفیت تھی۔ میں نے جلدی سے اسٹیئرنگ پر توازن قائم رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"اس سڑک پر سردار کے بندوں کی جیپ کھڑی ہے۔ وہ دیکھیں سگنل پر۔"

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ زبان خشک ہورہی تھی اور سرگوشیانہ لہجہ یوں ہانپ رہا تھا جیسے میلوں فاصلہ طے کرنے کے بعد یہاں پہنچی ہو۔

میں نے نرمی سے بازو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ اسی لمحے جیپ میں سوار تین اسلحہ بردار بندوں کی نظر ہماری طرف اٹھی تھی۔ انہوں نے جلدی سے آگے جھک کر اگلی سیٹوں پر بیٹھے دو بندوں سے کچھ بات کی تھی۔

"انھوں نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ خدا کے لیے یہاں سے نکل چلیں۔" خان زادی کا لہجہ دہشت سے بھرا گیا تھا۔

اب ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے کا ارادہ خواب بن گیا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اچانک رخ بدل کر ایک پتلی سی سڑک پر گاڑی ڈال دی۔

"وہ لوگ ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔" خان زادی شمیل پیچھے دیکھتے ہوئے بے ساختہ تھرا اٹھی۔

"ریلیکس۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان کے نرغے سے بچ نکلیں گے۔" میں اندھا دھند جیپ دوڑاتا چلا گیا۔ یہ سڑک غالباً کسی قصبے یا دیہات کی طرف جارہی تھی۔ اطراف میں ویرانی تھی۔ عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے تک بلی چوہے کا یہ کھیل جاری رہا۔ وہ مشکوک جیپ مسلسل تعاقب میں تھی۔ جانے ہم کدھر نکل آئے تھے۔ شہر کی حدود کب کی ختم ہوچکی تھیں۔

"اس طرح بات نہیں بنے گی۔" جنگل کی حدود شروع ہوتے ہی اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا تھا۔ رات کا وقت تھا اور اطراف میں کہیں کھیت تھے، کہیں جنگل تو کہیں مٹی کے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ یہاں چھپ کر تعاقب کرنے والوں کو ڈاج دیا جاسکتا تھا۔

یکلخت میں نے گاڑی روک دی۔ چھوٹا بیگ اپنے قبضے میں کیا اور جلدی سے دوسری طرف سے دروازہ کھول کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"آیئے۔ جلدی کیجیے۔ اب ہمیں پیدل بھاگنا ہوگا۔"

وہ اس وقت انکار یا اقرار کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ دشمن کسی بھی لمحے سر پر پہنچنا چاہتے تھے۔ سو بلا تامل اپنا ریشم سا ملائم ہاتھ میرے لمبے چوڑے مضبوط ہاتھ میں تھما دیا۔

اگلے لمحے ہم سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

جنگل میں ہر طرف تاریکی کا راج تھا، صرف جھینگروں کے بولنے اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم لوگ سڑک سے کافی دور آچکے تھے۔ جب سڑک پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ گویا وہ تعاقب کرتے ہوئے ہماری گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ اب وہ کسی بھی لمحے ادھر آیا ہی چاہتے تھے۔

"اب کیا ہوگا۔ وہ ہمیں با آسانی تلاش کرسکتے ہیں۔" خوف سے اس کا خون خشک ہوگیا تھا اور پورا بدن کانپ رہا تھا۔

"ہمیں کسی محفوظ جگہ چھپنا ہے تاکہ ان کی نظروں میں نہ آئیں۔" میں اس کا ہاتھ تھامے دوڑتا ہوا تیزی سے ادھر ادھر نگاہ بھی دوڑا رہا تھا۔

"شاید وہ لوگ ادھر ہی آرہے ہیں۔" اسی لمحے درختوں کے اندر سرسراہٹ اور قدموں کی دھمک کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ ایک لمحے کو تو میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا۔

ہم بھاگتے بھاگتے جنگل سے کچھ دور نکل آئے تھے۔ اب اطراف میں کچھ اونچے نیچے ٹیلے تھے مگر ان کی آڑ لے کر چھپنا بے کار تھا۔ فوراً دیکھے جاسکتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے اچانک ہم دونوں کے قدم ایک کھائی پر پڑے اور اگلے لمحے ہم دونوں اس گہری کھائی کے اندر تھے۔ خان زادی شمیل تو شاید چیخ ہی پڑتی مگر میں نے اس خدشے کے پیش نظر فوراً ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹا تھا۔

میں نے کچھ سنبھلتے ہوئے اس گڑھے کا جائزہ لیا تو ایک عجیب صورت حال سامنے آئی۔ گڑھے کی لمبائی چھ فٹ اور چوڑائی چار فٹ تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ اس کے اوپر چھت سی بنائی گئی تھی۔ جس طرح قبر پر بنائی جاتی ہے۔ اس کی اونچائی تقریباً چار فٹ تھی اور یہ صرف ایک طرف سے کھلی تھی جہاں سے ہم پھسل کر اندر گرے تھے۔ گویا اگر وہ سوراخ بند کردیا جاتا تو اوپر سے کچھ بھی نظر نہ آتا۔

میں چیتے کی سی تیزی سے اٹھا مگر پورا نہ اٹھ سکا کہ اونچائی صرف چار فٹ تھی تاہم کسی نہ کسی طرح رینگتا ہوا اس گڑھے کے منہ تک پہنچا۔ اور اردگرد سے سوکھی گھاس کا چھوٹا سا ڈھیر گڑھے کے منہ کے

پاس جمع کرنے کے بعد دوبارہ گڑھے میں رینگتا ہوا اتر گیا اور اندر سے ہاتھ ڈال کر گڑھے کے منہ پر رکھے گھاس کے ڈھیر سے سوراخ کور کرنے لگا۔ یہ دھیان رکھا کہ اندر ہوا پہنچنے کا انتظام رہے۔

سوراخ کا منہ بند ہوتے ہی گڑھے کے اندر مکمل تاریکی چھا گئی۔ میں کھسکتا ہوا جونہی لیٹنے لیٹنے کروٹ لے کر مڑا ایک نرم و گداز پر حرارت وجود سے ٹکرا گیا۔

"یہ یہ اس سوراخ کو کیوں بند کر دیا۔" خان زادی شمیل کی گھبرائی، دہشت زدہ آواز میرے بہت قریب سے کانوں میں سنائی دی تھی۔

"شی۔ آہستہ۔ شاید وہ لوگ ادھر ہی آ رہے ہیں۔" میں نے سرگوشی کی۔ "فی الوقت اس سے بہتر اور بروقت پناہ گاہ اور نہیں مل سکتی۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ لگتا ہے کسی قبر میں زندہ دفن ہو گئے ہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ زمین میں کیڑے مکوڑے بھی ہوں گے۔" وہ ایک دم بے اوسان ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

جگہ اس قدر تنگ اور ناکافی تھی کہ اس کی سسکیاں، اس کے بکھرے ٹوٹے سانس ٹھنڈے ٹھنڈے آنسو اور بال سیدھا میری گردن پر مس ہو رہے تھے۔ عجیب خجالت آمیز پوزیشن تھی۔ دونوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسی بے بسی کی گرفت میں آئیں گے۔

"وہ ادھر ہی ہوں گے۔ تلاش کرو اچھی طرح۔ مجھے یقین ہے وہ یہیں کہیں چھپے ہیں۔"

دوڑتے بھاگتے قدم سطح زمین پر تک گئے تھے۔ ایک تیز سی تحکمانہ آواز پورے ماحول کی خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی اندر تک پیوست ہوتی چلی گئی تھی۔

خان زادی شمیل کی تو جان ہی اٹک گئی۔ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ کھسکتی ہوئی اچانک میرے نزدیک ہو گئی۔ اس کے خاموش بے بس آنسو میری قمیص بھگوتے چلے گئے تھے۔ اوپر قدموں کی دھمک دھڑکنیں منتشر کر رہی تھی۔

خان زادی کا پورا بدن بارش میں بھیگی چڑیا کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے محض اسے حوصلہ دینے کے لیے آہستگی سے اس کے گرد بازو حمائل کر دیئے تو میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اگر پکڑے گئے تو مجھے تو خیر جو سزا ملے گی مگر خان زادی کا حشر عبرت ناک ہو گا۔ اسے کشمیر خٹک جیسے بھوکے درندے کے آگے چارے کے طور پر ڈال دیا جائے گا۔ اور اسے ایک ایسی زندگی گزارنی پڑے گی جس میں موت کی دعا تحفے کے طور پر مانگی جاتی ہے۔ غالباً یہی سوچیں اس کے ہراساں ہونے کا باعث تھیں۔ موت آنکھوں کے آگے تارے بن کر ناچ رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک ہم دونوں دم سادھے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ قدموں کی دھمک کبھی قریب آتی کبھی دور چلی جاتی۔

"وہ ادھر ہی ہیں۔ چاروں طرف گھیرا ڈال لو۔ ہم صبح ہونے تک ان کی تلاش جاری رکھیں گے۔" بالآخر ان کے سرغنہ نے اعلان کیا تھا۔

"اوہ۔" میرے ہونٹوں سے طویل سانس نکل گئی۔ گویا صبح تک ہمیں اسی مدفون میں رہنا تھا۔ میرے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑنے لگے تھے کہ بہر حال ہم عارضی طور پر ان کی دستبرد سے محفوظ تھے۔ وہ دو تین بار اس جگہ سے گزرے تھے مگر کھوج نہ پا سکے تھے۔ ایک طرف کی پریشانی سے وقتی طور پر نجات ملی تو دوسری کی طرف دھیان چلا گیا۔ اب تک تو ہم دونوں نے زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ ناپنے کی کشمکش اور خوف میں اپنی پوزیشن پر زیادہ غور نہیں کیا تھا مگر اب حسیات یکبارگی جاگ اٹھی تھیں اور اس نرم گرم قربت نے بری طرح حواس باختہ کر ڈالا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرے بازوؤں کا حلقہ اس کے گرد سخت ہو گیا۔

"آخر کو یہ گناہ تو نہیں ہے۔" میرا نفس اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے تاویلیں ڈھونڈ رہا تھا۔ "یہ میری جائز اور شرعی منکوحہ ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں جذبات کے سمندر میں خود کو سرکش و منہ زور لہروں کے حوالے کرتا ایک دم کہیں

اندر سے بے ربطی کی ستائی ہوئی تیک باتیں ذہن سے ٹکرانے لگیں۔

"پتر! کبھی کسی سے بے ایمانی نہ کرنا۔ کسی کو دھوکا نہ دینا۔ اور کسی کی امانت پر بری نظر نہ رکھنا۔ جو وعدہ کرو اسے نبھانا۔ ہمارے نبی جی فرماتے ہیں جس کا عہد نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔" میرے اندر جیسے دھماکے سے ہوتے چلے گئے۔ میں ایک دم ٹھٹک کر ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔ خود بخود میری گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"داود گل۔ سارے بندے واپس بلالو۔ وہ لوگ یہاں سے نکل چکے ہیں۔ ہوتے تو اب تک مل چکے ہوتے۔ تین گھنٹوں سے ہم لوگ خوار ہو رہے ہیں۔ حیات خان تم چل کر جیپ اسٹارٹ کرو۔ جہلم کی طرف چلتے ہیں ہو سکتا ہے اس شہر کے آس پاس مل جائیں۔"

ایک طویل اعصاب شکن انتظار کے بعد وہ حیات آفریں زندگی دینے والی آواز کان میں پڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔

"وہ۔ وہ نکل گئے ہیں۔" خان زادی شمیل نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بے تابی سے کہا۔

"شی۔ کم از کم دس منٹ ہمیں مزید انتظار کرنا چاہیے۔ کہیں وہ پلٹ کر نہ دیکھ لیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چال چلنے کے موڈ میں ہوں۔"

بہرحال دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد میں احتیاطاً" پہلے خود باہر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا' پھر تسلی کر لینے کے بعد گڑھے کے اندر ہاتھ بڑھا کر خان زادی شمیل کو باہر نکلنے میں مدد دی۔

"آہ۔!" یوں لگا جیسے صدیوں بعد کھلی تازہ ٹھنڈی ہوا میں سانس لیا ہو۔ میں بے اختیار لمبے لمبے سانس لے کر پھیپھڑوں میں فریش ہوا بھرنے لگا۔ اتنی دیر تک ساکت و صامت ایک ہی پوزیشن میں دبکے رہنے سے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہو گئی تھی۔ میں ادھر ادھر نظریں دوڑا کر سڑک کے آثار ڈھونڈ رہا تھا جہاں ہم نے اپنی جیپ پارک کی تھی۔ صبح کاذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ابھی صبح کی اذانیں ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ ارد گرد رات کا خواب آلود گم صم سناٹا اور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں خان زادی شمیل کا ہاتھ پکڑ کر اندازے سے ایک طرف چل پڑا۔

"وہ رہی گاڑی۔" پندرہ منٹ مسلسل چلتے رہنے کے بعد بالآخر ہم جیپ تک پہنچ چکے تھے۔

"اب ہم کہاں جائیں گے" خان زادی شمیل نے رکی جھجکی آواز میں نظریں جھکا کر پریشانی سے دریافت کیا۔

میں تیزی سے آئندہ کے لیے لائحہ عمل بنا رہا تھا۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے کیوں نہ ہم موٹر وے کے ذریعے لاہور چلے جائیں۔ غالباً" ساڑھے تین گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس کی رائے لی ہم دونوں جیپ پر سوار ہو چکے تھے اور حیرت انگیز طور پر خان زادی شمیل پیچھے بیٹھنے کے بجائے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

اس کے بے تحاشا لمبے ریشمی گھٹنوں کو چھوتے بال گرد آلود ہو چکے تھے اور بے ترتیبی سے شانوں' کمر اور گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں گال پر مٹی کے نشان نظر آ رہے تھے۔ دونوں ہاتھ اور پاؤں بھی مٹی مٹی ہو رہے تھے۔ یہی حال کپڑوں کا تھا۔ خود میری حالت بھی مختلف نہ تھی کپڑوں کا بیگ غالباً" افراتفری میں خان زادی رکھنا بھول گئی تھی۔ مجھے خود بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دو جوڑے کپڑے رکھ لیتا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ رات کے پچھلے پہر ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان یا بوتیک کے کھلے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایسے میں کیا کیا جائے۔

"کسی ہوٹل کا رخ کریں' کم از کم نہا دھو کر صاف تو ہو جائیں گے صبح دکانیں کھلنے کے بعد آپ جا کر کپڑے لے آئیے گا اس کے بعد لاہور کی طرف

ٹلیں گے۔" خان زادی شمیل کی تجویز بے حد مناسب تھی۔ سو میں نے یہی کیا۔ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ اسی کو غنیمت جانا۔ خان زادی آتے ہی باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ اس جیسی نازک طبع لڑکی کے لیے یہ اتنی گندگی اور گرد و غبار برداشت کرنا بڑا صبر آزما تھا۔

تقریباً دس بجے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں قریبی مارکیٹ چلا گیا۔ واپس آیا تو میرے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا اس میں دو میرے اور دو خان زادی شمیل کے سوٹ تھے۔

"معاف کیجیے گا، مجھے زنانہ شاپنگ کا قطعی کوئی تجربہ نہیں ہے ہو سکتا ہے آپ کو کپڑے کی کوالٹی رنگ یا سلائی پسند نہ آئے، اپنی طرف سے تو میں نے آپ کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے خریداری کی ہے لیکن۔۔۔"

"اتنے تکلفات میں کیوں پڑتے ہیں مظہر صاحب! اس وقت تو جو بھی مل جائے غنیمت ہے۔" اس کے انداز میں اپنائیت اور نرمی تھی۔

لفافہ کھول کر کپڑے پھیلا کر دیکھ رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کا کاٹن کا جدید تراش خراش کا ہلکا پھلکا سوٹ تھا اور دوسرا سیاہ فراک، سفید پاجامہ اور سفید بڑے سے سیاہ پٹی لگے سوتی دوپٹے پر مشتمل تھا۔ کپڑے دیکھ کر خان زادی شمیل کے چہرے پر چمک آ گئی۔

"یہ دونوں کلرز میرے پسندیدہ ہیں۔" اس کی آنکھوں میں سچ مچ ستائش تھی یا صرف مجھے ہی لگی۔

"چلیے۔" اس کی آواز سنتے ہی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور مڑ کر دیکھا۔ ایک لمحے کو میں ششدر سا رہ گیا۔

"سرخ کاٹن کے شلوار قمیص میں سرخ بڑا سا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے بالوں کی سیاہ گھنی بے حد چمکیلی چٹیا پشت پر ڈالے وہ اپنے یاقوتی مرطوب لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ اس کی بھوری خوابناک آنکھوں میں قدرتی گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی دودھیا چاندنی سی رنگت سرخ لباس میں ایک دم دہک کر شعلہ فشاں ہو گئی تھی۔

مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ جس لڑکی کو گزشتہ چار دن سے اپنے ہمراہ لیے پھر رہا ہوں وہ اس درجہ حشر ساماں اور قیامت خیز حسن و شباب کی مالک ہے۔

آج غیر ارادی و بے ساختہ اٹھنے والی نگاہ نے اس کا سراپا جائزہ لیا تھا۔ میری تفصیلی نظر کے بعد خان زادی شمیل پریشان و محجوب ہو گئی اور قدرے ترچھی ہو کر رخ پھیر لیا۔

"آئیے۔" میں ایکدم ہوش میں آ کر خود کو سنبھالتا ہوا سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ وہ حسب معمول اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے اس انداز سے اس کے مجھ پر اعتبار اور اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔

"کیا اب اس جیپ پر سفر کرنا خطرناک نہیں ہو گا۔" جوں ہی ہم موٹر وے کی کشادہ چھ رویہ سڑک پر عازم سفر ہوئے اچانک اسے خیال آ گیا۔

"کم از کم ایک آدھ دن تک ایسا امکان نہیں ہے۔ ان لوگوں نے خود دیکھا تھا کہ جیپ کھڑی تھی اور ہم وہاں سے غائب تھے، وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ اب ہم جیپ چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے سفر کریں گے۔" میرا جواب سن کر وہ مطمئن ہو کر سر ہلانے لگی۔

"دیکھیے کتنی حسین جگہ ہے اگر وقت ہوتا تو میں یہاں ٹھہرنا ضرور پسند کرتی۔" کلر کہار کے سرسبز و پرفضا مقام سے گزرتے ہوئے اس نے بے ساختہ مجھے متوجہ کیا تھا، اس کے انداز تخاطب میں دوستانہ سی بے تکلفی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے ایک نظر اس کی سمت دیکھا۔

وہ بہت دلچسپی سے میرے ہمراہ بیٹھی ارد گرد کے نظارے دیکھ رہی تھی۔

"میں لاہور کے تاریخی مقامات دیکھوں گی۔ زندگی میں پہلی بار پنجاب کے میدانی علاقوں کا سفر کر رہی ہوں۔ اس سے پہلے یہ میرے لیے ڈریم لینڈ ہی تھے۔"

لاہور پہنچ کر ہوٹل سے کھانا کھا کر اٹھے تو خان زادی شمیل نے فرمائش کی۔ وہ پہاڑی علاقوں کی پروردہ تھی۔ پشاور میں تعلیم کی غرض سے قیام تھا۔ بس اس کے علاوہ دیگر علاقوں کے بارے میں بس سن رکھا تھا۔ اس لیے اس کی دلچسپی فطری تھی۔ میں نے

رضامندی کے اظہار کے طور پر کندھے اچکا دیے۔
کوئی اور کام بھی تو نہیں تھا۔ یوں بھی ہمیں کون سا کسی جگہ پہنچنا تھا۔ بس بھٹکنا ہی تو تھا۔ سو تھوڑی سیر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے ہوٹل کے بجائے ماڈل ٹاؤن میں واقع ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کو ترجیح دی تھی تاکہ نظروں میں نہ آسکیں۔

اس دن یہاں ہمارا دسواں دن تھا۔ جب ویٹر شام کی چائے کمرے میں پہنچانے کے لیے آیا۔

میں اس وقت شام کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہم نے دو کمرے لیے تھے۔ دونوں سارا دن اپنے اپنے کمرے میں پڑے رہتے تھے۔ اسے کہیں تفریحاً جانا ہوتا تو بتا دیتی تھی۔

"صاحب جی! پولیس کے کچھ بندے آئے ہیں۔ یہاں کا معائنہ کرنے۔ انہیں ایک جاسوسی ایجنٹ اور اس کی ساتھی عورت کی تلاش ہے۔ مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہے ہیں۔ ان کو اطلاع ملی ہے کہ دونوں غیر ملکی ایجنٹ کسی گیسٹ ہاؤس میں روپوش ہیں اور ان کے پاس ایک جیپ بھی ہے۔"

ویٹر نے بڑی رازداری سے بتاتے ہوئے معنی خیز نظر مجھ پر ڈالی تھی۔

"کیا؟" میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں ایک دم اچھل کر بیڈ سے اٹھ گیا۔

"ہاں جی۔ پولیس ہر کمرے کی تلاشی لے رہی ہے اور پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

ویٹر تو بتا کر بلکہ بم دھماکا کر کے چلا گیا۔ مگر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مجھے شمیل کی فکر تھی۔

اس سے پہلے کہ باہر نکلتا دروازہ ایک تیز دستک کے ساتھ ہی کھلتا چلا گیا۔

پہلے گھبرائی بوکھلائی شمیل اندر داخل ہوئی اور اس کے پیچھے ایک چھریرے بدن اور لمبے قد کا پروقار سا پولیس آفیسر وردی میں نظر آیا۔ اس کے پیچھے اس کا اسسٹنٹ اٹین شن کھڑا تھا۔ خان زادی شمیل لپک کر میرے قریب چلی آئی تھی۔

"مسٹر مظفر حسین۔ یہی نام ہے ناں آپ کا۔" وہ آفیسر تیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ان محترمہ کا بیان ہے کہ آپ ان کے شوہر ہیں۔ کیا میں آپ کے کاغذات دیکھ سکتا ہوں۔"

"جی۔ کیوں نہیں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلی کیجیے۔" میں نے بروقت خود کو سنبھال کر پر اعتماد انداز میں جواب دیا۔ پھر اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا۔

"آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟" وہ بغور کاغذات دیکھ رہا تھا۔

"وادیٔ سوات کے ایک گاؤں اوڈیگرام سے۔ میں وہاں حیات ہاسپٹل میں ڈاکٹر کے فرائض انجام دیتا ہوں۔ میری مسز خان زادی شمیل بھی ڈاکٹر ہیں۔ ابھی پندرہ روز قبل ہماری شادی ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"اتنے دور دراز پہاڑی علاقے سے یہاں لاہور کس مقصد کے لیے آئے ہیں؟" اب وہ نکاح نامہ چیک کر رہا تھا۔

"ہنی مون منانے کے لیے۔" میں نے بلا جھجک رٹا رٹایا جواب دیا۔

"اصل میں خان زادی کے لیے میدانی علاقوں کی سیر و تفریح میں زیادہ دلچسپی اور کشش تھی۔"

"اوکے!" آفیسر پراسرار انداز میں مسکرایا۔ "اب آپ صرف ایک اور سوال کا جواب دے دیں پھر ہم مطمئن ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اس نکاح نامے سے ثابت ہو گیا ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اور آپ کے ہاسپٹل کے کارڈ سے یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ آپ ایک ڈاکٹر ہیں اور لاہور ہنی مون ٹرپ پر آئے ہیں۔ کیا یہ ناقابل یقین سی بات نہیں ہے کہ محض دو ہفتوں میں آپ ایک دوسرے سے اس حد تک بیزار ہو گئے ہیں کہ اتنے مہنگے گیسٹ ہاؤس میں دو کمرے کرائے پر لے کر رہ رہے ہیں؟"

"دیکھیے آفیسر! ہم دونوں ڈاکٹر ہیں اور احتیاط کے تمام تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں۔ میری بیگم کی ابھی پچھلے ہفتے پریگنینسی کنفرم ہوئی ہے۔ گائناکولوجسٹ نے ان کا کیس پیچیدہ قرار دیتے ہوئے سختی سے ہدایات کی ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ احتیاط

ملحوظ خاطر رکھی گئی۔"

خدا جانے کس جرات و جسارت سے میں نے بے دھڑک جواز دیا تھا۔

افسر کچھ جھینپ کر مسکرا دیا۔ "اوکے۔ ٹیک یور ٹائم۔ ہم چلتے ہیں۔ تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہیں۔" وہ اپنے اسسٹنٹ سمیت باہر نکل گیا اور اسی کے پیچھے خجالت و شرمندگی سے سرخ ہوتی ہوئی شمیل نکلی تھی۔ میں اپنی جگہ خجالت اور کھسیاہٹ کا شکار تھا۔

میں بے وقوفوں کی طرح سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

♥_♥_♥

بہرحال اگلے دن میں کوچ کرنے کا سوچ چکا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں کاؤنٹر پر خان زادی کے لیے پیغام چھوڑ کر ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ سہولت کے پیش نظر ایک کیبن بک کروالیا۔

واپس آیا تو اس کے کمرے میں دستک دے کر اندر چلا آیا۔

وہ بستر پر نیم دراز کندھوں تک کمبل لپیٹے کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آئیے پلیز۔" اس کا انداز شائستہ اور اپنائیت آمیز تھا۔

"کل ہم کراچی جا رہے ہیں 'بائے ٹرین۔'" میں ایک کرسی سنبھال کر اسے مطلع کرنے لگا۔ میرا جسم صبح سے بری طرح دکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بخار کا حملہ ہونے والا ہو۔ بدن میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ شاید موسم کا اثر تھا۔

"او۔ اچھا۔"

"آپ صبح تیار رہیے گا خان زادی!"

"ایک منٹ' میرا نام خان زادی نہیں شمیل ہے۔ آپ مجھے اس نام سے پکار سکتے ہیں۔"

اس نے جس طرح میری بات کاٹ کر مجھے ٹوکا' یہ مجھے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ تاہم میں نے دانستہ بات کو آگے نہیں بڑھایا۔

"چلیے شمیل بی بی! ایسے ہی سہی۔ آپ پلیز صبح تیار رہیے گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھیں گے نہیں۔" وہ ایک نظر مجھ پر ڈال کر بولی۔

"نہیں۔ خوا مخواہ آپ ڈسٹرب ہوں گی۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

میں باہر آگیا۔

اگلی صبح روانگی کے اوقات میں مجھ پر کسلمندی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ویٹر سے ڈسپرین منگوا کر کھالی تھی مگر سر درد میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟۔" پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں کھڑی شمیل نے تشویش سے پوچھا تھا۔

"جی۔ اللہ کا شکر ہے۔" میں نے اخلاقاً مسکرا کر تسلی کرائی۔

البتہ کوپے میں سامان رکھنے کے بعد مجھ میں ہمت نہیں رہی۔ کسی نہ کسی طرح سیٹ تک پہنچا اور بری طرح ڈھیر ہو گیا۔

شمیل پریشان سی ہو کر میرے قریب چلی آئی۔

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔" اس نے میری نبض چیک کی۔

"آپ کو تو ٹمپریچر ہے اچھا خاصا۔"

"بس ایسے ہی معمولی سا ہے۔ میں نے پین کلر لی تھی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں اس کے اس طرح اپنائیت سے ہاتھ پکڑنے پر گڑبڑا سا گیا تھا۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہتے ہوئے اس کی اپنائیت کے اس مظاہرے سے بچنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایک ڈاکٹر تھی۔ اور اندازہ لگا چکی تھی کہ کم از کم ۱۰۲ بخار تھا۔ وہ سیٹ پر میرے پاس بیٹھ گئی اور میرا سر دبانے لگی۔

"پلیز۔ شمیل بی بی۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔" میں بری طرح گھبرا کر اس کے ہاتھ ہٹانے لگا۔ "کیوں شرمندہ کرتی ہیں مجھے۔ آپ کا منصب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پلیز۔ آپ دوسری سیٹ پر تشریف رکھیے۔" اس کے ریشمی ہاتھوں کے لمس اور اس کے وجود سے پھوٹنے والی قدرتی سحر انگیز مہک نے

میرے چھکے چھڑا دیے تھے۔

"آپ اتنا تکلف کیوں برتتے ہیں مظہر! ہم اس وقت ایک جیسے حالات کا شکار ہیں اور ہماری منزل ایک ہے۔ آپ پچھلے دو ہفتوں سے میری خاطر تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ جواب میں میں نے تھوڑا سا تعاون کر دیا تو کیا ہوا۔"

اس کا شیریں لہجہ بہت سلجھا ہوا اور مہربان تھا۔ مسٹر مظہر یا مظہر صاحب کے بجائے صرف مظہر کہہ کر مخاطب کرنا بذات خود ایک دوستانہ اور اپنائیت آمیز تعلق کا اظہار تھا۔ وہ بدستور میرے پاس بیٹھ کر میرا سر دباتی رہی۔ میں متذبذب سا بے چین سا منع کرتا رہ گیا۔ یہ الگ بات تھی کہ دکھتی ہوئی کنپٹیاں، جلتا ہوا ماتھا اور سلگتے اعصاب اس کی عنایت کے سبب بتدریج سکون پا رہے تھے۔ میں نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی ملائم انگلیاں میرے بالوں کی جڑوں کو سہلاتی ہوئی دھیرے دھیرے مجھ پر ایک سرور آگیں کیفیت طاری کرتی گئی تھیں۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی، جانے کب میں نیند کی وادیوں میں اترتا چلا گیا اور جب ہوش آیا تو یہ دیکھ کر میرے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں کہ میرا سر اس کے زانو پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ تبسم ہوئی تھی۔ میں بری طرح گھبرا گیا، خود پر نفرین بھیجنے لگا۔

"اوہ۔ مم۔ میں۔ بے حد معذرت خواہ ہوں شمیل۔ شاید نیند کے جھونکے میں مجھ سے یہ گستاخی سرزد ہو گئی۔" عجب بوکھلاہٹ اور شرمندگی کے عالم میں میں کرنٹ کھا کر اٹھا تھا اور سٹپٹائے ہوئے انداز میں صفائیاں دے رہا تھا۔

"آپ کا بخار خاصا کم ہو گیا ہے۔ کہیے سر درد میں کچھ افاقہ ہوا؟۔"

وہ میری معذرت نظر انداز کرتے ہوئے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ بھلا ایسے گداز ریشم سے ہاتھوں کے لمس کی مسیحائی کے بعد درد باقی رہ سکتا تھا؟

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا ہوں۔ آپ نے کھانا تو نہیں کھایا ہو گا۔ رات کے نو بج رہے ہیں۔ ٹھہریے میں ڈائننگ کار سے منگواتا ہوں۔"

میں اس وقت خود کو بالکل ہونق محسوس کر رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے شمیل کو اوپر کی برتھ پر چڑھنے میں مدد دی۔ نچلی سیٹ پر میں خود دراز ہو گیا۔

*_*_*

تقریباً" دس بارہ دن کراچی میں مارے مارے پھرنے کے بعد میں نے اپنے سفر کی آخری منزل یعنی اپنے گاؤں کرم پور کا رخ کیا کہ خان حیات ابراہیم کے بندوں نے وہیں مجھ سے رابطہ کرنا تھا۔ اب ہمیں اڈیگرام سے نکلے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا۔ یقیناً" اب تک شمشیر خٹک سے تصفیہ ہو چکا ہو گا۔ کرم پور ضلع وہاڑی کی تحصیل میلسی کا ایک سرسبز و شاداب سا گاؤں تھا۔ زیادہ تر آبادی کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ شہر سے تانگے کے ذریعے گاؤں کے لیے روانہ ہوئے۔ جونہی گاؤں کے آثار نمودار ہوئے راہ میں میرے جاننے والے دکھائی دینے لگے۔ کوئی فصلوں میں اسپرے کر رہا تھا، کوئی کھیت میں ہل چلاتا ہوا، کوئی چارہ کاٹتے ہوئے، تو کبھی کوئی لڑکا اسکول کے راستے پر بستہ اور تختی لٹکائے نظر آ جاتا۔

وہ لوگ تجسس سے میرے ساتھ بیٹھی سیاہ فراک اور سفید دوپٹے پاجامے میں ملبوس شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی سنگ مرمر کی حسین مورت کو دیکھ رہے تھے۔ بلکہ جب تک گھر پہنچے ادھر سب میں ڈھنڈورا پٹ چکا تھا کہ مظہر حسین دلہن لے کر آ رہا ہے۔

بے بے جی کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔ وہ مجھ سے ملیں بھی تو بڑی ہراساں و پریشان کیفیت میں۔

"نھی! باجی کو غسل خانے لے جاؤ۔ ہاتھ منہ دھونے کے لیے اور ہاں خیال رہے یہ سرائیکی نہیں جانتیں۔ اردو میں بات کرنا۔ بے بے جی آپ کھانے پینے کا بندوبست کریں۔"

میں نے کچھ متذبذب کھڑی میری شکل دیکھتی شمیل کو آنکھ کے اشارے سے نھی کے ہمراہ جانے کا کہا اور پھر بے بے جی کے گرد بازو ڈال کر لاڈ سے ان

کے ساتھ ٹک گیا۔

"کیا بات ہے بے بے؟ ناراض ہو۔"

"بھلے ہے۔ تم نے تو اپنی کرلی۔" ان کا لہجہ نحیف اور مرتعش تھا۔ انہیں سخت صدمہ پہنچا تھا۔ "پلے بتا۔ میں اختری کو کیا جواب دوں گی۔ اسے کہہ چکی تھی غنیم کے لیے۔ مجو پتر تو ایسا تو نہیں تھا۔"

"بے بے جی! اتنی بے اعتباری۔" میں بڑی مدتوں بعد کھل کر بے فکری سے ہنسا تھا۔ "ارے یہ تمہاری بہو تھوڑی ہے بے بے۔ یہ تو ہماری مہمان ہیں۔ خان زادی ہیں۔ میرے مالک کی بیٹی۔ انہیں وہاں جان کا خطرہ تھا۔ مالک نے مجھ سے مدد مانگی اور ہدایت کی کہ اپنے گاؤں لے جاؤں حفاظت کے لیے۔ کچھ دنوں میں خطرہ ٹلنے کے بعد وہ ہمیں واپس بلالیں گے۔"

"اوہ اچھا۔ شکر ہے۔ تو پتر۔ پہلے بتاتا تھا ناں سارا قصہ۔" بے بے جی کی جان میں جان آگئی۔ چہرے کی رونق فوراً بحال ہوگئی تھی۔

"اے میں تو حق دق ہی رہ گئی تھی۔ بھلا میرا پتر ایسا ہو سکتا ہے۔ اچھا چل تو اندر جاکر آرام سے بیٹھ۔ میں ہانڈی دیکھتی ہوں۔ تم نے بہت اچھا کیا جو بچی کو لے آئے۔ آخر اس کے باپ نے بھی تو تیری مدد کی تھی۔"

یہاں کے زیادہ تر لوگ سرائیکی بولتے تھے۔ سانولی سلونی رنگت، جامنی ہونٹ، سخت جان، جفاکش اور بہادر لوگ یہاں بستے تھے۔ شمیل زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود گاؤں والوں کے سلوک سے بے حد متاثر تھی۔ بے بے جی کو تو اردو نہیں آتی تھی۔ البتہ اظہر اور منھی سے خوب گپ شپ چلتی۔ ہمیں آئے پانچ دن ہوئے تھے۔ جب خان حیات ابراہیم کی طرف سے رجسٹرڈ ڈاک سے ایک خط ملا۔ اس میں مختصراً لکھا تھا۔

"مظہر بیٹے!

خطرہ ٹل گیا ہے۔ دونوں چلے آؤ۔ ہم شدت سے منتظر ہیں۔"

میں نے شمیل کو خط تھمادیا۔

"آپ چلنے کی تیاری کریں۔" میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خوشی کی لہر ڈھونڈنی چاہی۔ "آپ کو بہت بہت مبارک ہو یہ رہائی۔ اب روز روز کی دربدری سے نجات مل چکی ہے۔ انشاء اللہ کچھ عرصے بعد آپ اپنی من چاہی اور خوشگوار زندگی کے سفر کا آغاز کررہی ہوں گی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ منتوں مرادوں کے بعد طلوع ہونے والے دن کا سورج اتنی ہی خوشی اور سکون لے کر آئے جتنا کہ سوچ رکھا ہوتا ہے۔"

اس کا چہرہ نارمل ہی تھا۔ کمال ہے اس خبر پر تو اسے خوشی سے گلاب کی طرح کھل جانا چاہیے تھا۔ میں اس کے چہرے سے کوئی خاص تاثر اخذ نہ کرسکا۔

"دوبارہ ضرور آیئے گا شمیل باجی۔" اظہر نے جاتے سمے بڑی اگاوٹ سے فرمائش کی تھی۔ شمیل دھیمے سے مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ ابھی دو تین ماہ بعد مظہر بھائی جی کی شادی ہوگی۔ بے بے جی نے ماسی اختری کو بتادیا ہے۔ آپ نے ان کی شادی پر تو ضرور ہی آنا ہے۔ میں آپ کو خط لکھ کر بتادوں گی۔" منھی کی پرجوش اطلاع پر بے ساختہ شمیل کی نظر مجھ پر جم گئی تھی۔ میں نے بھی لاشعوری انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ شمیل کی نظروں میں ایک گمبھیر سی سنجیدہ سی خاموشی اور سناٹا تھا۔ میں نے آہستگی سے نظر چرالی۔ ہم لوگوں کی واپسی بذریعہ ٹرین ہوئی۔ اٹک شہر کے اسٹیشن تک ہمیں ٹرین سے جانا تھا۔ جیپ تو میں لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ افراتفری میں۔

"چلیے۔ تمت بالخیر۔ یہ میرے ساتھ آپ کا آخری سفر ہے۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔

"کون جانتا ہے آگے کیا ہوگا۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔" میں نے خلوص سے اس کی طرف دیکھا۔

"شمیل بی بی! ایک بات آپ سے کہنا تھی۔ میرا اور آپ کا تقریباً بیس دن تک مسافرت کا ساتھ رہا ہے۔ اس دوران میں نے اپنی پوری کوشش کی ہے کہ

آپ کا احترام ملحوظ رہے۔ لیکن پھر بھی اگر مجھ سے کوئی گستاخی یا غلطی سرزد ہو گئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔" وہ بھنویں اچکا کر کچھ دیر تک جواباً مجھے دیکھتی رہی۔

"میں نے اس طویل سفر میں آپ کو بالکل ویسا ہی پایا جیسا سنا تھا۔ شریف، بہادر اور باکردار۔" اس کے پروقار لہجے میں میرے لیے تحسین تھی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" میں نچلے لب کا کونہ دانتوں میں دبا کر مسکرایا۔

"آپ تکلف کی مار کیوں مارتے ہیں مظہر! ہر بات پر غیریت کی دیوار تان دیتے ہیں۔" وہ کچھ جھنجلائی۔

"آپ سے ڈر جو لگتا ہے؟۔" میں خلاف عادت شوخ سا ہو گیا۔

"آپ بہت خوش لگ رہے ہیں۔" وہ نپی تلی نظر مجھ پر ڈال کر عجیب سے انداز میں گویا ہوگی۔

"جی۔ اس لیے کہ میں واقعی خوش ہوں۔ اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھانے پر ویسے اصولاً تو مجھ سے زیادہ آپ کو خوش ہونا چاہیے۔"

اس کے چہرے پر کچھ بے بسی سی ناگواری سی کیفیت طاری تھی۔ تاہم وہ خاموش بیٹھی لب چباتی رہی۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے آپ کو اس کے برعکس پایا جیسا سنا تھا۔"

وہ حیران نظریں مجھ پر ٹکا کر متوجہ ہو گئی۔

"آپ کی خود پسندی، خاموشی اور سرد مہری کے بڑے چرچے سنے تھے۔ لیکن میں نے آپ سے مل کر تفصیلی تجزیہ کر کے یہ جانا ہے کہ جسے لوگ آپ کی سرد مہری سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ حقیقتاً" مردوں کو فاصلے اور حد پر رکھنے کی ایک تدبیر ہے۔ جسے خود پرستی کا نام دیتے ہیں وہ نسوانی فخر و مان ہے اور نسائیت کا تقاضا بھی۔ اور رہی خاموشی تو دراصل یہ آپ کی باحیا اور شرمیلی فطرت کی عکاسی کرتی ہے۔"

شمیل کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"اگر ایسا نہ کیا جائے۔ مظہر صاحب تو عورت کے احترام کا تصور بھی فنا ہو جائے۔ مرد عورت کی خوش اخلاقی، نرم زبانی اور شرم و حیا کا ہمیشہ غلط مطلب لیتا ہے اور جھٹ خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ عورتیں جب غیر مردوں سے مخاطب ہوں تو سپاٹ اور سرد و سخت لب و لہجہ اختیار کریں تاکہ سننے والے کے دل میں کوئی جذباتی کیفیت بیدار نہ ہو۔ خوامخواہ کی اخلاقیات میں پھنس کر خواتین مردوں کو بے تکلف ہونے اور حد پار کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔"

"میں بھی تو آپ کے لیے غیر مرد ہوں۔ اصولاً" تو مجھ سے بھی آپ کا برتاؤ سخت ہونا چاہیے تھا۔" میں یونہی شرارتاً" بول پڑا۔ اس نے کشمکش کے عالم میں مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر گود میں رکھے ہاتھ کے ناخن دیکھنے لگی۔

"بے شک عارضی ہی سہی لیکن گزشتہ ایک ماہ سے آپ میرے شرعی محرم بنے ہوئے ہیں۔ میرا آپ سے جائز اور قانونی تعلق ہے اس لیے۔"

"پلیز۔ میں مذاق کر رہا تھا شمیل بی بی!" میں نے فوراً" ہاتھ اٹھا دیا تھا۔ اٹک سے آگے کا سفر بائی روڈ تھا۔

شام ہونے تک ہم لوگ حویلی پہنچ چکے تھے۔ خان حیات ابراہیم اور خان وجاہت نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ملازمین کو خاطر تواضع کا آرڈر دینے کے بعد دونوں شمیل کے ساتھ اندر چلے گئے تھے۔ غالباً" تمام تر حالات و واقعات خان زادی کے منہ سے سننا چاہتے تھے۔ خان وجاہت کے چہرے پر اضطراب آمیز سناٹا تھا۔ لیکن جب وہ آدھے گھنٹے بعد اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد خان حیات ابراہیم کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آئے تو وہ بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دیے۔

"ہمیں خوشی ہے مظہر بیٹے! کہ تم نے اپنا عہد پورا کیا۔ تم وفاداری اور ایمانداری کے اس امتحان پر پورے اترے ہو۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور فکر نہ کرو۔ تم ہر طرح سے محفوظ ہو۔ ہم نے اپنے قبیلے کے بندوں کو سمجھا دیا ہے۔ تم پر کوئی بندوق نہیں

اٹھائے گا۔ فیصلہ ہونے میں ہفتہ دس دن تو لگیں گے۔ تب تک چاہو تو حویلی رہ جاؤ۔ ورنہ اپنی پرانی رہائش گاہ میں چلے جاؤ۔ فیصلہ ہوجانے کے بعد تمہیں یہاں کی نوکری سے تو ہاتھ دھونے پڑیں گے لیکن تسلی رکھو ہم تمہارے گاؤں کے قریبی شہر کے ایک مشہور اسپتال میں تمہاری جاب کا انتظام کررہے ہیں۔ بس ایک دو دن تک ادھر سے فائنل کال آجائے گی۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہم تمہیں ذاتی کلینک بنوادیں گے وہیں وہاڑی میں۔ اب تم جاؤ آرام کرو۔"

میں سعادت مندی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے میں عجیب سے محسوسات کے ہمراہ اپنی رہائش گاہ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

سرخروئی کے احساس نے ذہن کو ہلکا پھلکا کردیا تھا۔ بتیس دنوں کی رفاقت پر مشتمل ایک عجیب و غریب اور پرخطر سفر اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔

یہ "غالباً" بلکہ "یقیناً" میری زندگی کا سب سے انوکھا سفر تھا۔

راہ میں کبھی پھول آئے، کبھی خار، کبھی تشکیک کا دھواں پھیلا تو کبھی اعتماد و اپنائیت کے بے ساختہ چشمے پھوٹے، کبھی خوف تو کبھی بہادری۔

کبھی جنگل تو کبھی میدان۔

دیکھو ذرا ادھر کہ چلے تھے جہاں سے ہم۔

کچھ پھول، کچھ چراغ ابھی واہموں میں ہیں۔

بے اعتمادیوں کا دھواں بھی سہی مگر۔

بکھرے ہوئے گلاب ابھی راستوں میں ہیں۔

اک پل رکو ہمیں سے بدلتے ہیں راستے۔

ٹھہرو ذرا کہ موڑ جدائی کا آگیا۔

اب سامنے ہی اور ہواؤں کا شہر ہے۔

اب تک تو اس طرف جو گیا سو چلا گیا۔

شمعیں تو کیا یہاں دیدہ و دل بھی بجھ گیا۔

ٹھہرو ذرا کہ مرگ تمنا سے پیشتر۔

اپنی رفاقتوں کو پلٹ کر بھی دیکھ لیں۔

گزری مسافتوں پہ بھی ڈالیں ذرا نظر۔

قربت کی ساعتوں کا مقدر بھی دیکھ لیں۔

شاید کہ پل ٹھیں نئے موسموں میں ہم۔

جاتی رتوں کے آخری منظر بھی دیکھ لیں۔

دریائے سوات کے کناروں پہ جمی برف کافی سے زیادہ پگھل چکی تھی۔ موسم بھی تو بدل رہا تھا۔ ہواؤں کی برودت میں خاصی کمی آگئی تھی۔

اپنے رہائشی مکان میں آکر میں نے ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ اتنے روز بند رہنے کی وجہ سے گھٹن سی ہوگئی تھی۔

"چل بھئی مظہر حسین! پہلے گرد سفر جھاڑ اور پھر گرد خانہ۔" میں کپڑے نکال کر غسل خانے کا رخ کرتے ہوئے خوامخواہ ہنس دیا۔ نہا دھو کر میں چائے کا سامان ڈھونڈنے لگا۔

چوکیدار کی میرے جانے کے بعد غالباً" حویلی یا ہسپتال میں ڈیوٹی لگادی گئی تھی۔ اب خود ہی کچھ کرنا تھا۔

†—†—†

"اس سے پہلے میں نے صرف کتابوں کہانیوں میں پڑھ رکھا تھا کہ شرم و حیا عورت کا زیور اور مرد کی پگڑی ہوتی ہے۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ مگر اب میں نے "عملاً" پرکھ لیا ہے آپا اماں کہ دنیا میں ایسے مرد بھی موجود ہیں جو ٹھوس کردار رکھتے ہیں۔ حیادار مرد کی نظر عورت کو اجال دیتی ہے۔ اسے نہال کردیتی ہے اور..... اور آپا اماں مجھے اجلا نکھرا رہنے کا بہت شوق ہے۔"

شمیل نے اچانک ہی سر جھکالیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔

"تم بڑی مشکل باتیں کرنے لگی ہو شمیل بیٹی۔ مجھ بڑھیا کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔"

عمر رسیدہ اور وفادار آپا نے بے بسی سے اس کی شکل دیکھی۔ شمیل کی ماں کی وفات کے بعد حویلی کی سب سے معمر ملازمہ نے اس کی پرورش کا بیڑہ سنبھال لیا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں حویلی میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خان حیات ابراہیم ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور انہوں نے ہی آپا اماں کو بلا کر

صورت حال واضح کرتے ہوئے قبیلے کے لوگوں کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا تاکہ وہ حمیل تک پہنچا دیں۔

"میں دھڑکنوں اور واہموں کے درمیان لٹک کر خود کو تباہ نہیں کرنا چاہتی۔ آج کس بہانے کس سے ملاقات کے لیے دیر ہوئی۔ کس کی چادر چھنی۔ کس کر سے دل بہلایا۔ شادی کے لیے معیار قرابت داری اور امارت ہی کیوں ٹھہرے۔ شرافت کیوں نہیں۔"

اس کے انداز میں ہٹ دھرمی اور قطعیت تھی۔ آپا اماں ششدر سی اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

اسے واپس لوٹے پانچواں دن تھا۔ خان حیات ابراہیم نے قبیلے کے سردار کی حیثیت سے گاؤں کے چند معتبر بندوں کو بلا کر معاملے کا جائزہ لینے کی رسمی کارروائی مکمل کرلی تھی۔ معززین نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا تھا کہ خان زادی کا نکاح فسخ کرا کے اسے خان وجاہت ابراہیم کی زوجیت میں دے دیا جائے اور مظہر حسن کو وادی چھوڑنے کا حکم دیا جائے۔ فریقین کو سوچ بچار کے لیے کل کے دن تک مہلت دی گئی تھی۔ پرسوں حتمی کارروائی عمل میں لائی جانی تھی۔ مگر حمیل بہت پہلے فیصلہ کر چکی تھی۔

"بیٹی! تم جو کہنا چاہتی ہو صاف کھل کر کہو۔ تاکہ میں خان جی تک تمہارے خیالات پہنچا سکوں۔" آپا اماں لجاجت آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"آپا اماں! آپ میرے لیے ماں کی جگہ بھی ہیں اور سہیلی بھی۔ میں آپ سے ہر بات کھل کر کہہ سکتی ہوں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں جب ہم یہاں سے نکلے تو کیا کیا واقعات پیش آئے۔" یہ کہہ کر وہ الف تا یے انہیں سلسلہ وار حالات سناتی چلی گئی۔

"وہ شخص ایسے لمحوں میں ثابت قدم رہا جب اسے پورے مواقع حاصل تھے۔ میں تو ان ہی لمحوں میں اس کی شرافت اور بلند کرداری کی اسیر ہو گئی تھی۔ اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر زندہ بچ گئی تو بقیہ زندگی اسی کے نام ہوگی۔"

"مگر وہ خان وجاہت کا کیا ہوگا بیٹی۔" آپا اماں کے پھر سے ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"ایسے شخص کا انجام نارسائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ جو منگیتر کے ہوتے ہوئے پرائی لڑکیوں پر ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں آیا۔ آج سے نہیں شروع سے ہی اس کے یہی اطوار رہے ہیں۔ لیکن اب میں سمجھوتا نہیں کر سکتی۔ یہ چانس مجھے قدرت نے دیا ہے۔ خان وجاہت کا ایمان تو اس درجے کمزور ہے کہ انہیں جائز ناجائز کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ ابھی یہ رنگ ڈھنگ ہیں تو بعد میں تو سوکن لانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ وہ تو تم پر جان چھڑکتے ہیں بس بھول چوک تو ہو ہی جاتی ہے۔ بیٹی! یہ تو وقت گزاری کے بہانے ہوتے ہیں سب۔"

"نہیں آپا اماں۔ ایسا عموماً ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور کمزور ایمان والا کسی رشتے کی عزت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ مجھے خان وجاہت کے طور طریقے شروع سے ہی کھٹکتے تھے۔ مگر رشتے کی نوعیت ایسی تھی کہ لامحالہ مجھے خاموشی اور نظراندازی کی عادت اپنانی پڑی۔ کہ خان بابا کی یہی مرضی تھی۔ مگر اب اتنے بڑے دھچکے کے بعد میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ اس دفعہ تو کسی نہ کسی طرح خان بابا نے تدبیر لڑا کر مجھے بچا لیا اگر کچھ عرصے بعد پھر کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا تو کیا مجھے اس کی بیوی کی حیثیت سے دوبارہ دشمن کی خدمت میں پیش کیا جائے گا؟"

آپا اماں چپ کی چپ رہ گئیں۔

"سوچ لو بیٹی! اگر فیصلہ مظہر حسین کے حق میں دو گی تو یہ علاقہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑے گا۔ پھر وہ ایک معمولی سا آدمی ہے۔ ایک عام ڈاکٹر کی معاشرے میں حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟"

"باکردار انسان کبھی عام نہیں ہوتا اور رہی حیثیت تو وہ ہم دونوں مل کر خود بنا لیں گے اور دوسروں سے منوا بھی لیں گے۔ بس ارادے مضبوط ہونے چاہئیں۔"

آپا اماں دم بخود بیٹھی ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

"اس سے بھی پوچھ لیا ہے۔ اس کی کیا مرضی ہے؟

ہو سکتا ہے اس کا یا اس کے گھر والوں کا ارادہ بدل گیا ہو۔" شمیل کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"یہی پوچھنے کے لیے میں آج اس کی رہائش گاہ پر جا رہی ہوں۔ آپ ذرا دھیان رکھیے گا۔ میں ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گی؟۔" وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔

"ابھی۔ اس وقت؟۔" آیا اماں خوفزدہ ہو گئیں۔ شام گہری ہونے لگی تھی۔ اور خان ابراہیم کسی لمحے حویلی آیا ہی چاہتے تھے۔

"بیٹی! صبح پوچھ لینا۔ خان جی آنے والے ہیں اور خان وجاہت بھی گھر پر ہیں۔ انہوں نے پوچھ لیا تو میں کیا بتاؤں گی۔" میرون اونی کپڑوں پر میرون شال اچھی طرح اوڑھتی شمیل کی طرف دیکھتے ہوئے آیا اماں بے بسی سے گویا ہوئیں۔

"کوئی بہانہ کر دیجیے گا۔ میں ابھی آئی۔ کل کبھی نہیں آیا کرتی آیا اماں، جو کچھ ہے وہ آج ہے۔" وہ تیز قدموں سے پیدل ہی گھر چل پڑی، جانتی تھی کہ کل سارا دن خان حیات اور خان وجاہت گھر میں رہیں گے اور مظہر کو بلا کر طلاق نامے پر سائن کروا لیں گے۔ وہ اس سے پہلے مظہر تک پہنچنا چاہتی تھی۔

♥-♥-♥

"آ۔ آپ۔ آپ۔ یہاں۔ اس وقت۔" اگر کوئی بم بلاسٹ ہو جاتا تو بھی مجھے اتنی گھبراہٹ نہ ہوتی جتنی اس وقت شمیل کو اپنے دروازے پر دیکھ کر ہوئی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔

"مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟۔" اس نے متانت سے کہا۔

"جی۔ جی۔ پلیز۔" میں بوکھلا کر ایک طرف ہو گیا۔

"معاف کیجیے گا۔ میرے پاس خواتین کو بٹھانے کے لیے کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ یہی ایک کمرہ ہے جہاں میں کھاتا، سوتا اور پڑھتا ہوں۔ آپ کو یہیں زحمت کرنا ہو گی۔"

کشادہ کمرے کے دائیں طرف میرا پلنگ تھا۔ اس کے مقابل ایک میز تھی جس کے ساتھ کتابوں کا ریک رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں فقط دو کرسیاں تھیں جن میں سے ایک پر میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا اور دوسری پر میڈیسن کی چار پانچ کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ میز پر چائے کا خالی کپ اور دوپہر کے کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ مجھے فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کہاں بٹھاؤں۔ جب تک یہ عقل آئی کہ کرسی سے کتابیں اٹھا لوں تب تک وہ طائرانہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی مدھم مسکراہٹ لیے میرے پلنگ کے کنارے پر بیٹھ چکی تھی۔

"معاف کیجیے گا میں ابھی آتا ہوں۔ چولہے پر سالن رکھا ہوا ہے۔"

کچھ جلنے کی خوشبو نتھنوں میں گھستے ہی میں بیوقوفوں کی طرح اٹھ کر کمرے کے دائیں جانب بنے کچن کی طرف دوڑا تھا۔ چولہا بند کر کے واپس کمرے میں آیا تو خاصی حد تک اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا چکا تھا۔ موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ کسی بھی لمحے بارش ہونے کا امکان تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنے خراب موسم میں جبکہ رات پڑنے کو تھی میرے پاس کیوں آئی تھی۔ خان حیات ابراہیم یا خان وجاہت کو خبر ہو گئی تو بہت برا ہو گا۔ اس نے خطرہ مول لے کر مجھ تک پہنچنا کیوں ضروری خیال کیا۔

"جی آپ کہیے۔ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ ویسے آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" میں کرسی پلنگ کے مقابل لا کر کچھ فاصلے پر رکھ کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔

"مگر کیوں۔ میں کسی غیر کے پاس تو نہیں آئی؟۔ معا" اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ نظریں ملیں اور نجانے کس احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا کہ میں نگاہ نہ بچا سکا۔

وہی خوابناک آنکھیں، یاقوتی لب، چاندی جیسی رنگت اور بالوں کا سیاہ ریشم جو بیس دن تک شب و روز تک میری آنکھوں کے سامنے رہا تھا۔ اب بھی میرون شال کے ہالے میں نظر کو خیرہ کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ نظریں جھکا چکی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے دماغ کو حاضر کیا۔

"اب تو غیر ہی سمجھ لیں۔ کل خان جی نے مجھے

حویلی بلایا ہے اور آپ جان ہی چکی ہیں کہ کس لیے۔"

"کیا آپ یہ سب اپنے دل سے پوچھ کر کہہ رہے ہیں؟۔" نجانے کیوں اس کی آواز لرز گئی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں یہ فیصلہ اپنے ضمیر کی آواز پر کر رہا ہوں۔ میں امین ٹھہرایا گیا تھا اور اب وہ وقت آگیا ہے جب میں امانت واپس کر کے ایمان کی آزمائش میں سرخرو قرار دیا جاؤں۔"

"مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔" وہ لب کاٹ کر جھکے سر کے ساتھ گویا ہوئی۔ مجھے کرنٹ سا تو لگا تھا۔

"مگر کیوں؟ خان وجاہت آپ کے منگیتر ہیں اور آپ انہیں پسند بھی کرتی رہیں پھر۔۔۔"

"وہ میرے منگیتر ضرور رہے ہیں یہ سچ ہے اور اس رشتے کے احترام میں 'میں مروتاً' ان سے بات بھی کر لیتی تھی لیکن وہ میری پسند یا انتخاب کبھی بھی نہیں تھے۔ اس وقت فیصلے کی ڈور خان بابا کے ہاتھ میں تھی لیکن اب وہ یک طرفہ فیصلہ صادر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس فیصلے میں آپ بھی شریک ہیں اور میں چاہتی ہوں آپ میرے حق میں فیصلہ دیں۔"

"آپ کے حق میں؟۔" میں احمقوں کی طرح منہ کھولے ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی بے بے جی بہت نرم دل اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ وہ شمیم کے بجائے مجھے بہو کے روپ میں دیکھ کر خفا تو ہوں گی مگر مجھے یقین ہے وہ مجھے ضرور قبول کر لیں گی۔ میں ان کو اپنی محبت اور خدمت سے راضی کر لوں گی۔ منجھی، صغریٰ آپا اور اظہر بھی یہ اطلاع پا کر خوش ہوں گے۔ ہاں آپ کا مسئلہ ہے البتہ۔ اگر آپ کو شریک زندگی کے طور پر میری ہمراہی پر اعتراض نہ ہو تو ہم کل ہی علاقہ چھوڑ کر یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

اس نے رخ موڑ کر اپنی بات کا مکمل مفہوم سمجھا دیا۔

میں پتھر کے بت کی طرح ایستادہ اس کا سراپا دیکھ رہا تھا۔ بے بے جی کو تو واقعی راضی کیا جا سکتا تھا کیونکہ انہوں نے شمیم کے لیے بطور خاص مجھ پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ ماؤں کو تو بس اپنے ہاتھ سے بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کی چاہ ہوتی ہے۔ میں شمیل کو اپنے ہمراہ دہاڑی لے جا کر ان سے کہہ سکتا تھا کہ جان کے خطرے کے پیش نظر لڑکی کے باپ کی خواہش پر اسے یہاں لایا ہوں۔ ابھی شادی نہیں ہوئی۔ چاہیں تو اسے اپنی بیٹی سمجھ کر اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر بیٹے کا گھر آباد کر دیں اور اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں احسان فراموشی کا مظاہرہ کروں تو ابھی آپ کے حکم پر اسے واپس اس کے علاقے میں چھوڑ آتا ہوں۔

مجھے یقین تھا بے بے جی اس جذباتی بلیک میلنگ پر ایک منٹ میں رام ہو جائیں گی اور جھٹ اسے کلیجے سے لگا لیں گی۔ وہ سیدھی سادی دیہاتی عورت تھیں۔ انہیں چھل فریبوں کی کیا خبر۔ جو ہوں گا اس پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آئیں گی۔ مگر مسئلہ خود شمیل کا تھا۔

"کیا آپ نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔" میں کچھ جھجکتے ہوئے اس کے سامنے اس سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر پوچھنے لگا۔

"میرا مطلب ہے مجھ جیسے غریب اور عام سے بندے کے ساتھ گزارا کر سکیں گی؟ ایسا نہ ہو آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"پچھتانے کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ شریف ہیں، بہادر ہیں۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت مند اور باصلاحیت ہیں۔ ایک محنتی ڈاکٹر ہیں۔ یقیناً "اللہ تعالیٰ رزق کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بنادے گا۔ خان بابا وہاڑی میں آپ کے لیے ذاتی کلینک کھول دینے کے انتظامات مکمل کر چکے ہیں۔ ہم دونوں پریکٹس کریں گے۔ زندگی کی گاڑی مل کر کھینچیں گے۔"

اس کے پاس ہر بات کی دلیل وضاحت کے ساتھ موجود تھی۔ میرے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"لگتا ہے، آپ پوری تیاری سے آئی ہیں۔" میں قدم بڑھا کر درمیانی فاصلہ کم کرتے ہوئے مسکرایا۔

"اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے اور آپ اس پر ثابت قدم ہیں تو میں بھی یہی کہوں گا کہ چلیں اب بادبان کھولیں دوبارہ سفر کا آغاز کرنے کے لیے۔ قسمت سے اگر اتنی اچھی بیوی مل گئی ہے تو میں بھلا کیوں کفران نعمت کروں گا۔"

میں نے کچھ جھینپتے ہوئے، سر کھجاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ بھی جھینپ رہی تھی۔

"آپ نے دلی رضامندی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے ناں؟۔"

وہ ابھی تک متذبذب تھی۔ جواب میں، میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، بس اک نظر وارفتگی سے اسے دیکھا، پھر بے تابانہ اس کے ہاتھ کھینچ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ میری گرفت کی شدت ہی میرے جذبات کی غماز تھی۔

زبان سے اسے کیسے بتاتا کہ میں بھی تو اس کے سحر سے بچ نہ سکا تھا۔ اسی دن اس کا اسیر ہو گیا تھا جب وہ میرے لائے ہوئے سرخ کپڑوں میں ملبوس اچانک سامنے چلی آئی تھی۔ وہ میری پہلی بے ساختہ و بلا ارادہ نظر بھی اسی کی جانب اٹھی تھی اور پھر نظر لوٹ کر نہیں آئی لیکن میں نے نہ صرف اس سے بلکہ خود سے بھی یہ راز چھپا کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ میں بدنیت اور بدعہد نہیں کہلانا چاہتا تھا۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا۔

یہ ایک طویل اور تھکا دینے والی داستان ہے۔ خان وجاہت ابراہیم میرے طلاق نامے سے انکار پر بری طرح بپھر گئے تھے انہوں نے مجھ پر رائفل تان لی مگر خان حیات ابراہیم نے فوری مداخلت کرتے ہوئے مجھے اپنے گارڈز کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی بیٹی کی خوشی اور ضد کے آگے جھک گئے تھے اور خان وجاہت کو کسی طرح سمجھا بجھا کر وقتی طور پر ٹھنڈا کر دیا۔

اگلی رات انہوں نے پراسرار انداز میں مجھے اور شمیل کو یہاں سے فرار کروا دیا۔

میں شمیل کو لے کر سیدھا اپنے گاؤں کرم پور چلا آیا۔ بے بے جی کو کس جدوجہد سے منایا یہ بھی ایک صبر آزما کہانی ہے۔

بہرحال تین ماہ ہم لوگ گاؤں ٹھہرے۔ اس دوران خان حیات ابراہیم نے اپنے وعدے کے مطابق وہاڑی میں کلینک کھلوا دیا اور میں شمیل کو لے کر شہر میں کرائے کے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔

آج اس واقعے کو ایک سال ہونے والا ہے۔

ہم دونوں میاں بیوی اپنا کلینک خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ اور اس قابل ہو گئے ہیں کہ فلیٹ چھوڑ کر ایک کشادہ سا مکان قسطوں پر خرید لیا ہے۔ بے بے جی، ننھی اور اظہر کو بھی یہیں شہر میں بلوا لیا ہے، خان حیات ابراہیم اس دوران تین مرتبہ وہاڑی آ کر چپکے سے ہم سے مل کر گئے ہیں۔ شمیل کو آج کل بے بے جی نے کلینک آنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے کیونکہ وہ چار پانچ ماہ بعد ہمارے گھر کے آنگن میں ایک مہکتا ہوا جیتا جاگتا پھول کھلانے والی ہے۔

بظاہر یہ سب کچھ خیال و خواب اور افسانہ سا لگتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی افسانوی سچویشن حقیقت کا حصہ بھی بن جایا کرتی ہے۔ کیا آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں؟

♥